www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

July-August 2022 • Rs. 40

یہ دنیا حقیقتوں کی دنیا ہے، اس کے باوجود بہت سے لوگ
خوش خیالیوں کی بنیاد پر اپنا مستقبل بنانے کا خواب دیکھتے ہیں۔

July-August 2022 | Volume 47 | Issue 4

Editor-in-Chief
Prof. Farida Khanam

Assistant Editor
Farhad Ahmad

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: cs.alrisala@gmail.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹ 40 per copy
Subscription by Book Post	₹ 200 per year
Subscription by Regd. Post	₹ 400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Al-Risala Monthly
Punjab National Bank
A/c No. 0160002100010384
IFSC Code: PUNB0016000
Nizamuddin West Market Branch

To order books by Maulana Wahiduddin Khan, please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871
Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

Goodword Bank Details
Goodword Books
State Bank of India
A/c No. 30286472791
IFSC Code: SBIN0009109

تحریر

مولانا وحید الدّین خاں

فہرست

Printed and published by Saniyasnain Khan
on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd.
A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market
New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan Total Pages: 52

اللہ کی محبت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے: عَنْ أَبِي أُمَامَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: حَبِّبُوا اللَّهَ إِلَى عِبَادِهِ، يُحِبَّكُمُ اللهُ (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 7461)۔ یعنی ابو امامہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اللہ تعالی کو لوگوں کے نزدیک محبوب بناؤ، اللہ تم لوگوں سے محبت کرے گا۔ ایک اور روایت میں یہ اضافہ ہے: وَحَبِّبُوا النَّاسَ إِلَى اللَّهِ يُحْبِبْكُمُ اللهُ (الاولیاء لابن ابی الدنیا، حدیث نمبر 43)۔ لوگوں کو اللہ کے نزدیک محبوب بناؤ، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

یہ دراصل دعوت کا بیان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتی کلام کو ایسے انداز میں ہونا چاہیے کہ اس سے لوگوں کے اندر اللہ کی محبت پیدا ہو۔ دعوت کا پر محبت اسلوب بلاشبہ سب سے زیادہ اعلیٰ اسلوب ہے۔ انسان کو پیدا ہونے کے بعد ہر لمحہ خدا کی نعمت کا تجربہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دریافت کرتا ہے کہ پوری کائنات اس کے لیے کسٹم میڈ بنائی گئی ہے۔ جب انسان اس حقیقت کو دریافت کرے گا تو وہ فطری طور پر اس کائنات کے خالق سے محبت کرے گا۔ خاص طور پر اللہ کی نعمتوں کا ذکر کیا جائے تو بلاشبہ یہ انسان کے اندر اللہ کی محبت جگانے والی باتیں ہیں۔ اسی طرح لوگوں کو قرآن کی یہ آیت سنائی جائے: قُلْ يَاعِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (39:53)۔ یعنی کہو کہ اے میرے بندو، جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بیشک اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، وہ بڑا بخشنے والا، مہربان ہے۔

اس سے لوگوں کے اندر اللہ کی بے پناہ محبت پیدا ہوگی۔ اس سے لوگوں کے اندر وہ اسپرٹ جاگے گی، جس کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: مَا أُحِبُّ أَنَّ لِيَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا بِهَذِهِ الْآيَةِ (مسند احمد، حدیث نمبر 22362)۔ یعنی مجھے پسند نہیں ہے کہ اس آیت کے بدلے میرے پاس دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں موجود ہوں۔

طوفان کا سبق

30 مئی 2022 کو دہلی میں طوفان آیا، جس کی وجہ سے دہلی میں کافی نقصان ہوا۔ انگریزی روزنامہ ٹائمس ناؤ (*Times Now*) کی ویب سائٹ پر یہ خبر اس عنوان کے تحت شائع ہوئی— شدید بارش اور اولوں کے طوفان نے دہلی اور این سی آر میں تباہی مچائی، بجلی کی سپلائی متاثر، کاریں ٹوٹے ہوئے درختوں کے نیچے دب گئیں:

Power outages, cars trapped under fallen trees as heavy rain, hailstorm lash parts of Delhi-NCR (https://rb.gy/or3all)

اسی طرح مئی 2022 میں بہار میں طوفان آیا تھا، اس کی خبر اس طرح آئی تھی: بہار شدید طوفان کی زد میں ہے، آسمانی بجلی گرنے سے بھاری نقصان ہوا۔ طوفان سے بہار کے 16 اضلاع میں موجود ہزاروں افراد متاثر ہوئے ہیں۔ طوفانی ہواؤں کے باعث درجنوں مکانات تباہ ہوئے جب کہ ہزاروں افراد بے گھر ہو گئے ہیں (www.rb.gy/i20kry)۔ ایسی بے شمار مثالیں ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے انسان قدرتی آفات کے آگے کتنا بے بس ہو جاتا ہے۔

قدرتی آفات انسان کی نظروں کے سامنے رونما ہوتے ہیں۔ وہ گھر جس کو ایک انسان محنت اور محبت سے بناتا ہے، اس کو قدرتی آفات اس طرح تہس نہس کر دیتے ہیں، جس طرح سرکاری مشنری غیر قانونی طور پر تعمیر شدہ گھروں کو توڑ دیتی ہے، اور انسان بالکل بے بس بنا ہوا ہوتا ہے، گویا کہ گھر پر اس انسان کا کوئی حق نہ ہو۔ وہ انسان انتہائی بے بسی کے ساتھ اپنے گھر کو ٹوٹتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔

یہ صرف طوفان کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ انسان اگر غور کرے تو وہ ہر اعتبار سے عاجز ہے۔ وہ زمین پر موجود لائف سپورٹ سسٹم کے بغیر وہ ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتا، یہاں تک کہ لائف سپورٹ سسٹم کے اندر بھی خالی آنکھوں سے نہ دکھائی دینے والا ایک حقیر وائرس (مثلاً کووڈ 19) اس کو بے بس اور لاچار کر دیتا ہے۔ یہ واقعات سبق دیتے ہیں کہ انسان دنیا کا ماسٹر نہیں ہے، اس دنیا کا ماسٹر اللہ رب العالمین ہے، جو اس کو چلا رہا ہے۔ انسان کے لیے یہی سزاوار ہے کہ وہ اس خالق کے آگے اپنے آپ کو سرینڈر کرے۔ (ڈاکٹر فریدہ خانم)

انسان کا درجہ

قرآن کی سورہ التین میں انسان کے بارے میں ایک فطری قانون بیان کیا گیا ہے۔ بعض تاریخی شہادتوں کو پیش کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا ٱلْإِنسَٰنَ فِيٓ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ۔ ثُمَّ رَدَدْنَٰهُ أَسْفَلَ سَٰفِلِينَ۔ إِلَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَعَمِلُواْ ٱلصَّٰلِحَٰتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ (95:4-6)۔ یعنی، ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچے پھینک دیا۔ مگر جو لوگ ایمان لائے اور صالح اعمال کیے تو ان کے لیے کبھی ختم نہ ہونے والا اجر ہے۔

قرآن کی ان آیتوں میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے امکان (potential) کے اعتبار سے اعلیٰ ترین مخلوق کا درجہ رکھتا ہے۔ کوئی انسان، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اس دنیا میں جب آتا ہے، تو وہ لامحدود امکان (unlimited potential) لے کر آتا ہے۔ مگر اس امکانی درجہ تک صرف وہ لوگ پہنچیں گے جو خدا کے تخلیقی اسکیم کو شعوری طور پر سمجھیں اور اس کے مطابق اپنی زندگی کی منصوبہ بندی کریں۔ جو لوگ ایسا نہ کرسکیں وہ سارے امکان کے باوجود محرومی کا کیس بن کر رہ جائیں گے۔

امکان خدا کا عطیہ ہے۔ لیکن امکان کو پہچاننا، اور اس کو واقعہ بنانا ہمیشہ انسان کا اپنا کام ہوتا ہے۔ جو آدمی اپنے ذاتی حصہ کی ذمہ داری کو ادا کرنے میں ناکام رہے وہ ہمیشہ کے لیے ناکام ہو گیا، کوئی دوسری چیز اس کو اس انجام سے بچانے والی نہیں۔ انسان کو صرف اس اِمکان کو پہچاننا ہے۔ پہچاننے کے بعد اس کے امکانات فطرت کے زور پر اَن فولڈ (unfold) ہونے لگتے ہیں، اور یہ سلسلہ تاعمر جاری رہتا ہے، وہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

اپنے امکان کو واقعہ بنانے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی غور و فکر کے ذریعہ اپنے بارے میں تخلیق کے نقشہ کو سمجھے۔ پھر وہ اس تخلیقی نقشہ سے کامل رعایت کرتے ہوئے اس کے مطابق اپنی عملی سرگرمیاں جاری کرے۔ وہ حق اور ناحق میں فرق کرنا جانے، وہ ناحق سے دور رہتے ہوئے اپنے آپ کو حق کا پابند بنائے۔

ماننے سے پہلے تحقیق

قرآن کی سورہ الحجرات میں اجتماعی زندگی کے بارے میں ایک اصول بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ کسی بات کو صرف سن کر نہ مان لیا جائے۔ مذکورہ آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچادو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے'' (49:6)۔

لوگ جب مل جل کر رہتے ہیں تو اجتماعی زندگی کے نتیجہ میں بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ ایک کو دوسرے کی طرف سے بار بار خبریں پہنچتی ہیں۔ ان خبروں پر سننے والے کا ردعمل کیا ہونا چاہیے اسی کی بابت ایک اصول مذکورہ آیت میں بتایا گیا ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ سننے والا جب کسی بات کو سنے تو ماننے سے پہلے اس کی تحقیق کرے۔ تحقیق کے بغیر صرف سننے کی بنیاد پر کوئی رائے قائم نہ کی جائے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ اکثر ایک کی بات دوسرے تک صحیح شکل میں نہیں پہنچتی۔ بات کو پہنچانے والا درمیانی شخص اکثر بات کو بدل دیتا ہے۔ مزید یہ کہ ہر بات کا ایک بیک گراؤنڈ یا موقع ومحل ہوتا ہے۔ مگر بات کو نقل کرنے والا اکثر ایسا کرتا ہے کہ وہ بیک گراؤنڈ کو بتائے بغیر مجرد شکل میں بات کو بیان کردیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بات اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے کچھ ہوتی ہے اور سننے والے تک پہنچ کر وہ کچھ اور ہوجاتی ہے۔ اس غلط فہمی کی بنا پر سننے والا آدمی غلط رائے قائم کرتا ہے اور غلط اقدام کرڈالتا ہے جس کا نتیجہ آخر کار اس صورت میں نکلتا ہے کہ آدمی اپنے کیے پر شرمندہ ہوتا ہے، حالاں کہ اب وقت اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہوتا ہے۔

یہ مسئلہ ہر سماج میں پیش آتا ہے۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر یہ مزاج بنائے کہ وہ صرف سن کر کسی بات کو نہ مان لے۔ ماننے سے پہلے وہ ضروری تحقیق کرے۔ اور اگر وہ تحقیق نہیں کرسکتا تو ایسی حالت میں اس کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ سنی ہوئی بات کو بھلا دے۔ وہ اس پر نہ کوئی رائے قائم کرے اور نہ اس کی بنیاد پر کسی اقدام کا منصوبہ بنائے۔

تنقید، تنقیص

قرآن کی سورہ الحجرات میں اجتماعی زندگی کے کچھ آداب بتائے گئے ہیں۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ''اے ایمان والو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ ایک دوسرے کو طعنہ دو اور نہ ایک دوسرے کو برے لقب سے پکارو''۔ (49:11)

قرآن کی اس آیت میں اس اجتماعی مسئلہ کا ذکر ہے جو اکثر ایک اور دوسرے کے درمیان اختلاف کی صورت میں پیدا ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اختلاف پیش آتے ہی دوسرے کو غلط اور اپنے کو صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ اس نفسیات کے تحت یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کا مذاق اڑانے لگتا ہے۔ وہ اس کی طعنہ زنی کرتا ہے۔ وہ اس کو برے نام سے پکارنے لگتا ہے۔ وہ اس کو بدنام کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ چیزیں سماج کے اندر نفرت پیدا کردیتی ہیں۔ خوشگوار باہمی تعلقات کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ یہ ایک سماجی بگاڑ ہے جس کا برا نتیجہ ہر ایک کو بھگتنا پڑتا ہے۔

اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ لوگ صرف رایوں کے اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کی ذات کے بارے میں برا گمان قائم نہ کریں۔ اختلاف کے وقت لفظی ریمارک دینے سے مکمل پرہیز کریں۔ اس کے بجائے وہ ایسا کریں کہ جب کسی سے اختلاف پیدا ہو تو سنجیدگی اور غیر جانبداری کے ساتھ اس پر غور کریں اور پھر اپنی بات کو دلیل کے انداز میں بیان کریں۔ علمی تنقید میں کوئی حرج نہیں، مگر کسی کی ذات کی تنقیص یقینی طور پر بری چیز ہے اور انسان کی اجتماعی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔

اجتماعی زندگی میں لوگوں کا سابقہ ایک دوسرے کے ساتھ جس چیز میں پڑتا ہے وہ زبان ہے۔ زبان کا غلط استعمال آپس میں تلخی پیدا کردیتا ہے اور زبان کا درست استعمال آپس میں محبت کو بڑھاتا ہے۔ زبان سے آدمی صرف کچھ الفاظ بولتا ہے مگر یہ الفاظ عملی اعتبار سے بڑے بڑے نتائج پیدا کرتے ہیں، اچھے بھی اور برے بھی، خواہ خاندانی زندگی ہو یا وسیع تر معنوں میں سماجی زندگی، ہر جگہ زبان کا استعمال بے حد اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ زبان کے استعمال میں بے حد محتاط رہے۔

ڈی کنڈیشننگ کی ضرورت

قرآن کے مطابق، جنت میں داخلہ ان افراد کو ملے گا، جنھوں نے دنیا میں اپنا تزکیہ کیا ہوگا۔ مثلاً قرآن کی ایک آیت کے الفاظ یہ ہیں: وَذَلِكَ جَزَاءُ مَنْ تَزَكَّى (20:76)۔ یعنی، اور یہ (جنت) جزاء ہے اس شخص کے لیے جس نے اپنا تزکیہ کیا۔ اس آیت میں جس تزکیہ کا ذکر ہے اس کو انسانی زبان میں ڈی کنڈیشننگ (deconditioning) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

ڈی کنڈیشننگ دوسرے الفاظ میں سیلف کریکشن (self-correction) کے عمل کا نام ہے۔ آدمی اپنے بچپن اور جوانی کی عمر میں ذہنی اعتبار سے غیر پختہ (immature) ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں وہ تجزیہ کرنے اور صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہر آدمی اپنے ماحول کے اعتبار سے متاثر ذہن (conditioned mind) بن جاتا ہے۔ اس حقیقت کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر فطرت صحیحہ پر ہوتا ہے۔ مگر ماحول سے متاثر ہو کر وہ غیر فطری زندگی اختیار کرلیتا ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1385)۔

اس کو نفسیات کی اصطلاح میں کنڈیشننگ (conditioning) کہتے ہیں۔ اس کنڈیشننگ کی بنا پر آدمی اس قابل نہیں رہتا کہ وہ چیزوں کو بے آمیز صورت میں دیکھ سکے۔ وہ چیزوں کو ویسا نہیں دیکھتا جیسا کہ وہ ہیں۔ بلکہ وہ چیزوں کو اس طرح دیکھتا ہے جیسا کہ اس کا ذہن اس کو دکھانا چاہتا ہے۔ اس لیے صحیح طرز فکر یا آبجیکٹیو تھنکنگ (objective thinking) کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہر آدمی اپنی ڈی کنڈیشننگ کرے۔ وہ اپنے ذہن کے اوپر پڑے ہوئے مصنوعی پردوں کو ایک ایک کرکے ہٹادے، اور دوبارہ اپنے آپ کو فطری شخصیت بنائے۔ خود احتسابی کا یہ عمل ہر آدمی کو لازماً کرنا ہے۔ اس ڈی کنڈیشننگ کے بغیر کوئی آدمی اس قابل نہیں ہوسکتا کہ وہ حقیقت شناس بنے، وہ چیزوں کے بارے میں بالکل درست رائے قائم کرسکے۔ دوسرے الفاظ میں، ڈی کنڈیشننگ کے بغیر کوئی انسان فطری شخصیت یا مزکی شخصیت نہیں بن سکتا۔

ایثارِ نفس

قرآن کی سورہ الحشر میں اعلیٰ انسانوں کی صفات بتائی گئی ہیں۔ ان اعلیٰ صفات میں سے ایک صفت ایثارِ نفس ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے: وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59:9)۔ یعنی، ''اور وہ دوسروں کو اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوں''۔ یہ آیت اگرچہ انصارِ مدینہ کے ریفرنس میں ہے، مگر اس کا حکم عام ہے۔

ایثارِ نفس ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ ایثارِ نفس کا مطلب ہے، اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دینا۔ اپنے حق میں کمی کر کے دوسرے کا حق پورا کرنا۔ یہ صفت ایک فرد کے لیے اعلیٰ انسانیت کا مظاہرہ ہے، اور سماجی اعتبار سے وہ سماج کی مجموعی ترقی کا ضامن ہے۔ یہی وہ عالی حوصلگی ہے جو کسی گروہ کو تاریخ ساز گروہ بناتی ہے۔

انسانیت کی مجموعی ترقی کے لیے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہی صفت ہے۔ جس سماج کے افراد میں یہ مزاج ہو کہ وہ اپنے آپ کو بھلا کر دوسرے کی مدد کریں۔ وہ اپنی سیٹ کو خالی کر کے دوسرے کو بیٹھنے کی جگہ دیں۔ وہ دوسرے کی خوبی کا اعتراف کر کے اس کو آگے بڑھائیں تو ایسے سماج میں مجموعی ترقی کا عمل کامیابی کے ساتھ جاری رہتا ہے۔

جس سماج میں یہ صفت ہو اس میں آپس کی محبت بڑھے گی۔ لوگ ایک دوسرے کے لیے قربانی دینے کے لیے تیار رہیں گے۔ سماج کے لوگوں میں حسد اور بغض اور خودغرضی جیسی برائیوں کی جڑ کٹ جائے گی۔ ایسے سماج میں اعلیٰ اخلاقی اوصاف پرورش پائیں گے۔ لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے خیر خواہی ہوگی۔ ایسا سماج گویا ایک خاندان کی مانند ہوگا جس میں لوگ بھائی بہن کی طرح مل کر رہیں گے۔

ایثارِ نفس بظاہر ایک قربانی ہے۔ مگر اسی میں ذاتی فائدہ کا راز بھی چھپا ہوا ہے۔ جو آدمی دوسروں کے ساتھ ایثار کا معاملہ کرے وہ دوسروں کے دل کو جیت لیتا ہے، اور جب دلوں کو جیت لیا جائے تو اس کے بعد کوئی اور چیز جیتنے کے لیے باقی نہیں رہتی۔

لالچ کا نقصان

قرآن میں ایک ایسی اخلاقی برائی کی نشاندہی کی گئی ہے جو انسان کی کامیابی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں: فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنفِقُوا خَيْرًا لِّأَنفُسِكُمْ ۗ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (64:16)۔ پس تم اللہ سے ڈرو جہاں تک ہو سکے۔ اور سنو اور مانو اور خرچ کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اور جو لوگ اپنے جی کے لالچ سے بچا لیے گئے تو وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

شُحّ نفس کا مطلب ہے حرص (greed)، یعنی اپنی ضرورت سے زیادہ کا خواہش مند ہونا۔ یہ دراصل دل کی تنگی ہے۔ انسانوں میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ تنگ دل اور فراخ دل۔ تنگ دل انسان وہ ہے جو اپنی ذات کے دائرہ میں محدود ہو کر سوچے۔ جس کا مقصد صرف اپنی ذات کو فائدہ پہنچانا ہو۔ یہی وہ آدمی ہے جو لالچ یا شحِ نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

کوئی شخص جب بھی کوئی فائدہ حاصل کرتا ہے تو وہ سماج کے مجموعی تعاون کی مدد سے حاصل کرتا ہے۔ ایسی حالت میں لالچ یا تنگ دلی کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے لیے تو سماج سے لینا چاہتا ہے مگر وہ خود سماج کو دینا نہیں چاہتا۔ اس قسم کی خودغرضی کبھی کسی کے لیے مفید نہیں ہو سکتی، نہ فرد کے لیے اور نہ قوم کے لیے۔ یہ حقیقت ایک حدیثِ رسول میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: الْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1427)۔ یعنی، دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

اس دنیا میں کامیابی صرف وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو کھلا دل رکھتے ہوں۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ جتنا بڑا دل اتنی بڑی کامیابی۔ بڑے دل والا آدمی اس بات کا حوصلہ رکھتا ہے کہ وہ دوسروں کی رعایت کرے۔ وہ دوسروں کو فائدہ پہنچا کر خوش ہو۔ وہ شکایت کے باوجود دوسروں کے ساتھ بہتر معاملہ کرے۔ وہ معاملات کو بلند سطح سے دیکھے۔ جس آدمی کے اندر یہ اعلیٰ صفات ہوں وہ لوگوں کے درمیان باعزت درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اور جو آدمی دوسروں کے درمیان باعزت درجہ حاصل کر لے اس کی کامیابی کو کوئی روکنے والا نہیں۔

اعلیٰ اخلاق

سورہ القلم میں اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے اور اس کو انسانیت کا اعلیٰ مرتبہ قرار دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت کے الفاظ یہ ہیں: وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (68:4)۔ یعنی، اور بے شک تم ایک اعلیٰ اخلاق پر ہو۔

افراد کے اندر اچھا اخلاق ہونا کسی سماج کو اچھا سماج بناتا ہے۔ اور افراد کے اندر برا اخلاق ہونا کسی سماج کو برا سماج بنا دیتا ہے۔ اخلاق دراصل، داخلی احساس کا خارجی اظہار ہے۔ داخلی سطح پر کوئی انسان جیسا ہوگا، اُس کا اثر اس کے خارجی برتاؤ پر پڑے گا۔

اس آیت میں بظاہر رسول سے خطاب ہے۔ مگر وہ ہر انسان کے لیے ایک عمومی تعلیم ہے۔ وہ ہر انسان کو اعلیٰ انسان بننے کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ اعلیٰ اخلاق سے مراد وہ اخلاق ہے جب کہ آدمی دوسروں کے رویہ سے بلند ہو کر عمل کرے۔ اس کا طریقہ یہ نہ ہو کہ برائی کرنے والوں کے ساتھ برائی اور بھلائی کرنے والوں کے ساتھ بھلائی، بلکہ وہ ہر ایک کے ساتھ بھلائی کرے۔ خواہ دوسرے اس کے ساتھ برائی ہی کیوں نہ کر رہے ہوں۔

اعلیٰ انسان کا اخلاق یہی دوسرا اخلاق ہوتا ہے۔ اس قسم کا اخلاق کسی انسان کے بارے میں یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک بااصول انسان ہے۔ ایسا اخلاق اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کی شخصیت حالات کی پیداوار نہیں بلکہ وہ خود اپنے اختیار کردہ اعلیٰ اصول کی پیداوار ہے۔ جس انسان کے اندر اس قسم کا اعلیٰ اخلاق ہو وہی حقیقی انسان ہے اور جس آدمی کے اندر یہ اعلیٰ اخلاق نہ پایا جائے وہ انسان کی صورت میں ایک حیوان ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

اعلیٰ اخلاق کی صفت انسان کو حیوان سے جدا کرتی ہے۔ حیوان مساویانہ اخلاق کی سطح پر جیتے ہیں۔ کوئی ان کو نہ چھیڑے تو وہ بے ضرر رہیں گے اور اگر کوئی ان کو چھیڑ دے تو وہ اس کے لیے ضرر رساں بن جائیں گے۔ اعلیٰ انسانی اخلاق یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے رویہ سے بلند ہو کر اپنا رویہ بنائے۔ دوسرے لوگ خواہ اس کے ساتھ اچھے نہ ہوں مگر وہ ہمیشہ دوسروں کے ساتھ اچھا معاملہ کرے۔

ناپ تول میں فرق کرنا

قرآن کی کچھ آیتوں میں زندگی کی ایک حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ ان آیتوں کے الفاظ یہ ہیں: وَيۡلٞ لِّلۡمُطَفِّفِينَ ۔ ٱلَّذِينَ إِذَا ٱكۡتَالُواْ عَلَى ٱلنَّاسِ يَسۡتَوۡفُونَ ۔ وَإِذَا كَالُوهُمۡ أَو وَّزَنُوهُمۡ يُخۡسِرُونَ (83:1-3)۔ یعنی، خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی۔ جو لوگوں سے ناپ کرلیں تو پورا لیں۔ اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں۔

قرآن کی ان آیتوں میں ناپ اور تول کی مثال سے ایک سماجی برائی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ قرآن میں اس کو تطفیف کے لفظ میں بتایا گیا ہے۔ اس میں اس کردار کا ذکر ہے جس کا یہ حال ہو کہ اس کو جب اپنے لیے لینا ہو تو وہ بھر پور طور پر لے۔ اور جب دوسروں کو دینا ہو تو وہ کمی کر کے دوسروں کو دے۔ یہ تفریق ایک ایسی اخلاقی برائی ہے جو آدمی کو تباہی کے سوا کہیں اور نہیں پہنچاتی۔

اس معاملہ کا تعلق زندگی کے تمام پہلوؤں سے ہے۔ مثلاً خود اپنی تعریف سننے کا حریص ہونا مگر دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کرنے میں بخل کرنا۔ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے خوب ہوشیار ہونا مگر دوسروں کے مفاد کو سمجھنے کے لیے نادان بن جانا۔ معاملات میں اپنے لیے رعایت چاہنا اور دوسروں کو رعایت دینے کے لیے تیار نہ ہونا۔ اپنی ذات کے معاملہ میں حساس ہونا اور جب معاملہ دوسروں کا ہو تو بے حس بن جانا۔ اپنے لیے انصاف چاہنا اور دوسروں کے ساتھ بے انصافی پر راضی رہنا۔ یہ تو جاننا کہ مجھے کیا پسند ہے، مگر دوسروں کی پسند اور ناپسند کے بارے میں بے خبر رہنا۔ اپنی عزت خطرہ میں ہو تو اس کو برداشت نہ کرنا مگر دوسروں کی عزت پر حملہ ہو تو اس کے بارے میں بے حس بن جانا، وغیرہ۔

اپنے اور غیر میں اس قسم کا ہر فرق تطفیف ہے۔ جس آدمی کے اندر اس قسم کا مزاج ہو وہ کبھی ترقی کے اعلیٰ درجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس قسم کا مزاج آدمی کے اندر اعلیٰ صفات کی پرورش میں مستقل رکاوٹ ہے۔ اور جس آدمی کے اندر اعلیٰ صفات کی پرورش رک جائے اس کا انجام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی ترقی کے اعلیٰ مراحل طے کرنے سے محروم رہے اور آخر کار وہ اسی حال میں مر جائے۔

مشقتوں کے درمیان

قرآن کی سورہ البلد میں فطرت کا ایک قانون بتایا گیا ہے۔ اس قانون کا تعلق تمام انسانوں سے ہے، خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، خواہ وہ بظاہر اچھے ہوں یا برے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی آیت یہ ہے: ’’ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا ہے‘‘ (90:4)۔

قرآن کے اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں انسان کے ساتھ بار بار پر مشقت حالات پیش آئیں، اس کو مختلف قسم کی مشکلات سے گزرنا پڑے۔ یہ فطرت کا ایک قانون ہے۔ کسی بھی تدبیر کے ذریعہ اس قانون کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ہر انسان کو لازماً اس امتحان سے گزرنا ہے۔ اس دنیا میں مشقتوں سے فرار ممکن نہیں۔

یہ ایک عام انسانی تجربہ ہے کہ زندگی مشقتوں سے خالی نہیں۔ علمی تحقیقات سے بھی یہی ثابت ہوا ہے۔ روسی ماہر نفسیات نمیلو (Anton Vitalievich Nemilov, 1879-1942) نے لکھا ہے — یہ ناقابل تصور ہے کہ انسانی زندگی المیہ سے خالی ہو:

> Human life is unthinkable without tragedies, without the tragic element. The more highly developed and nearer to perfection man is, the greater are the possibilities for tragic conflicts. (Biological Tragedy of Woman, p. 13-14)

مشقت جب خود فطرت کے قانون کے مطابق، انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے تو ہمیں اس کو مان کر اس کا حل تلاش کرنا چاہیے، نہ کہ اس کا انکار کر کے۔ زندگی کو اس نہج پر کیوں بنایا گیا۔ یہ خود انسان کے فائدے کے لیے ہے۔ مشقتیں انسان کو انسان بناتی ہیں۔ جو انسان مشقتوں کا تجربہ نہ کرے وہ زندگی کی گہری حقیقتوں سے بے خبر رہے گا۔ مشقت ایک کورس ہے جو آدمی کو گہری حقیقتوں سے واقف کراتا ہے۔ وہ آدمی کے چھپے ہوئے امکانات کو ظہور میں لاتا ہے۔ وہ کسی آدمی کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔ مشقت زحمت میں رحمت (blessing in disguise) کے ہم معنی ہے۔ مشقت ہر قسم کی ترقیوں کا زینہ ہے، جہاں مشقت نہیں وہاں ترقی بھی نہیں۔

مشکل میں آسانی

قرآن کی سورہ الانشراح میں موجودہ دنیا میں جاری فطرت کے ایک اٹل قانون کا بیان ہے۔ وہ قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر خاتمہ ایک نئے امکان کو لیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں کسی کے لیے کسی بھی حال میں مایوسی کی ضرورت نہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن کا بیان یہ ہے: ”پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے“ (94:4-5)۔

قرآن کی اس آیت میں فطرت کے ایک راز کو کھولا گیا ہے۔ وہ راز یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی مسئلہ کبھی اکیلا نہیں آتا، اس کا حل بھی ساتھ آتا ہے۔ اس دنیا میں ہر ڈس ایڈوانٹج (disadvantage) کے ساتھ ایڈوانٹیج (advantage) موجود ہے۔ اس دنیا میں ہر مائنس پوائنٹ (minus point) کے ساتھ پلس پوائنٹ شامل ہے۔ اس دنیا میں ہر نقصان کے ساتھ فائدہ کا ایک امکان چھپا ہوا ہے۔

مشکلات اپنی حقیقت کے اعتبار سے کوئی مصیبت یا برائی نہیں، مشکلات انسانی زندگی کے لیے ایک ترقیاتی کورس ہے۔ مشکلات انسانی شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں۔ مشکلات کے درمیان انسان کو وہ سبق اور وہ تجربہ حاصل ہوتا ہے جو اس کے ذہنی ارتقاء کے لیے ضروری ہے۔ مشکلات انسان کے ذہن کو جگاتی ہیں۔ مشکلات انسان کو سنجیدہ بناتی ہیں۔ مشکلات انسان کو حقیقت پسند بنانے کا ذریعہ ہیں۔ مشکلات سے گزرنے کے بعد انسان کے اندر وہ اعلیٰ صفات پیدا ہوتی ہیں جن کو احتیاط، ضبطِ نفس، ڈسپلن، احساس ذمہ داری اور اعتراف کہا جاتا ہے۔ جو لوگ مشقت کے کورس سے نہ گزریں وہ سطحی انسان بن کر رہ جائیں گے۔ ایسے لوگ انسانیت کے اعلیٰ درجہ تک نہیں پہنچ سکتے۔

موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں کوئی حالت یکساں طور پر باقی نہ رہے۔ یہاں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ ہر تاریکی اپنے ساتھ روشنی لے آتی ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اس کو کوئی سٹ بیک (setback) پیش آئے تو وہ نہ گھبرائے اور نہ وہ مایوس ہو۔ اگر وہ اپنے ہوش وحواس کو برقرار رکھے تو بہت جلد وہ دوبارہ اپنے حق میں ایک نیا امکان پالے گا۔ وہ اپنے عمل کی نئی منصوبہ بندی کر کے دوبارہ ترقی اور کامیابی کی منزل پر پہنچ جائے گا۔

ایج شاک

آئزک نیوٹن (1643-1727) کو ایپل شاک کا تجربہ پیش آیا۔ اس تجربے نے اس کو قوت کشش (gravity) کے انکشاف تک پہنچایا۔ یہ انکشاف انسانی تاریخ میں ایک عظیم دریافت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح بڑھاپا کسی انسان کے لیے ایک ایسا شاک ہے، جو اس کی پوری سوچ کو جگا دیتا ہے۔ اس سے آدمی اگر سبق سیکھے تو وہ انسان کو جنت تک پہنچا دے گا۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: طُوبَى لِمَنْ طَالَ عُمُرُهُ، وَحَسُنَ عَمَلُهُ (الزھد والرقائق لابن المبارک، حدیث نمبر 1340)۔ اس کے لیے خوش خبری ہے، جس کی عمر لمبی ہو، اور اس کے عمل اچھے ہوں۔

انسان پیدا ہوتا ہے تو وہ پاتا ہے کہ یہاں اس کے لیے ایک کسٹم میڈ یونیورس موجود ہے۔ انسان کے لیے آکسیجن کا انتظام ہے، جس کے بغیر اس کی زندگی محال تھی۔ اس کے لیے پانی اور غذائی اشیا فراہم ہو رہی ہیں۔ اس طرح کی چیزیں زمین پر اپنے آپ موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار چیزیں ہیں، جس کو انسان اپنی عقل اور تجربہ کے ذریعے دریافت کرتا ہے۔ مثلاً کمپیوٹر اور بجلی جیسی سائنسی ایجادات۔

مثلاً سائفن صفائی کی ایک سادہ تکنیک ہے، جو واش روم میں کوئی مسئلہ پیدا کیے بغیر اس کی گندگی کو پوری طرح صاف کر دیتا ہے۔ سائفن جیسی تکنیک جس کی مدد کے لیے زمین میں ایک طرف گریویٹیشنل پل کا نظام موجود ہے، اور دوسری طرف فضائی دباؤ (atmospheric pressure) ہے، جس کی وجہ سے انسان کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ آلودگی سے پاک زندگی گزار سکے۔

Siphon: a tube used to convey liquid upwards from a reservoir and then down to a lower level of its own accord. Once the liquid has been forced into the tube, typically by suction or immersion, flow continues unaided.

پیڑ پودے سے لے کر سائفن (siphon) اور کمپیوٹر تک ہر چیز خالق کی اعلیٰ منصوبہ بندی کی مثال ہے۔ سورج کی روشنی اور چڑیوں کا چہچہانا اور زمین پر اور سمندروں میں قسم قسم کے جاندار، وغیرہ۔ اس قسم کی ان گنت حیات بخش چیزیں اس کائنات میں ہیں، دنیا کا ہر انسان بلا استثنا ہر لمحہ جزئی یا کلی طور پر ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ جدید دور میں جس سائنسی برانچ کے ذریعہ ان حقائق کی اسٹڈی کی جاتی

ہے، اس برانچ کو ایکولوجی (Ecology) کہتے ہیں۔ یعنی وہ سائنسی طریقِ مطالعہ جس میں کسی ماحول میں رہنے والے جاندار مخلوقات (بشمول انسان) اور بے جان مخلوق (پیڑ، پودے، پہاڑ وغیرہ) کے ایک دوسرے پر اثرات اور تعلقات کی تحقیق کی جاتی ہے:

Ecology, also called bioecology, bionomics, or environmental biology, study of the relationships between organisms and their environment.
Ecology is the study of organisms and how they interact with the environment around them.

اللہ نے جس عالم کو تخلیق کیا، اس کے ہر جزء پر خالق کی شہادت ثبت (stamped) ہے۔ یہ تخلیقات انسان کو اس کے خالق کی یاددہانی کراتی ہیں۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ کائناتی نشانیوں کے ذریعہ اللہ رب العالمین کو دریافت کرے۔ اس کی دریافت اتنی زیادہ گہری ہو کہ وہ أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 50) کا کیس بن جائے۔ یعنی تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو، گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ بات صرف عبادت کی حد تک نہ ہو، بلکہ خدا اس کا واحد کنسرن (sole concern) بن جائے۔ وہ ہر چیز میں اللہ کی کارفرمائی کا مشاہدہ کرے۔ اس کے لیے اللہ کا معاملہ صرف رسمی عقیدہ کا معاملہ نہ رہے، بلکہ اللہ اس کے لیے ایک زندہ عقیدے کا معاملہ بن جائے۔

مگر انسان ان نشانیوں کے درمیان بے خبری کی زندگی گزارتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہوجاتا ہے، اور پھر بڑھاپا اس کے لیے ایک شاکنگ تجربہ بن کر یاد دلاتا ہے کہ خالق کے کتنے انوکھے انعامات ہیں۔ مگر وہ اس کے ذریعے خدا کو جاننے کے معاملے میں اندھا بہرا بنا رہا۔ اس کے بعد بڑھاپا آخری وارننگ کے لیے آتا ہے۔ حدیث میں ہے: مَنْ عُمِّرَ سِتِّينَ سَنَةً، أَوْ سَبْعِينَ سَنَةً، فَقَدْ عُذِرَ إِلَيْهِ فِي الْعُمُرِ (مسند احمد، حدیث نمبر 9251)۔ یعنی جس کو ساٹھ سال یا ستر سال کی عمر دی گئی، اس کے لیے عمر کے معاملے میں عذر پورا کر دیا گیا۔

جو خدائی نشانیوں (آیات) کے باوجود اس زمین پر بے خبر بنا رہے، اس کے بعد اس کے لیے قیامت کا دھماکہ ہے، جو انسان کو آخری طور پر جگاتا ہے۔ لیکن اس وقت انسان کا جاگنا اس کے کچھ کام نہیں آتا۔ (19 اگست 2020)

الفاظ، الفاظ، الفاظ

کچھ لوگ بولتے ہیں، وہ مسلسل طور پر بولتے ہیں، ان کے الفاظ کبھی ختم نہیں ہوتے۔ لیکن یہ الفاظ معانی سے خالی ہوتے ہیں۔ ان کے الفاظ میں نہ کوئی تجزیہ (analysis) ہوتا ہے، نہ کوئی وزڈم (wisdom)، نہ کوئی گہری معنویت۔

یہ وہ لوگ ہیں، جن کے پاس الفاظ کا کبھی ختم نہ ہونے والا ذخیرہ ہوتا ہے، لیکن یہ الفاظ حکمت سے خالی ہوتے ہیں۔ آپ ان کی باتوں کو گھنٹوں سنتے رہیے، لیکن ان کی باتوں میں آپ کو کوئی حکمت یا کوئی لرننگ کی بات نہیں ملے گی۔ حتی کہ آپ اس سے بھی بے خبر رہیں گے کہ انھوں نے کیا کہا۔ ان کی باتوں میں آپ کو کوئی ٹیک اوے (takeaway) نہیں ملے گا۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن کے پاس حافظہ (memory) ہوتا ہے، مگر ان کے پاس دانش مندی (wisdom) نہیں ہوتی۔ ان کے پاس گہرا مطالعہ نہیں ہوتا۔

فارسی کا ایک مثل ہے: یک من علم را، دہ من عقل می باید۔ یعنی ایک من علم کے لیے دس من عقل چاہیے۔ یہ بات اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب کہ آدمی بولنے سے زیادہ سوچے، وہ بولنے سے زیادہ تجزیہ کرے، اس کے اندر مثبت سوچ (positive thinking) پائی جاتی ہو، وہ نفرت اور تعصب سے خالی ہو، وہ چیزوں کو ان کی اصل حقیقت کے اعتبار سے دیکھنے لگے۔ اس کے اندر وہ صفت موجود ہو، جس کو حدیث میں دعا کی شکل میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اللَّهُمَّ أَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا، وَارْزُقْنَا اتّباعه، وأَرِنَا البَاطِلَ بَاطِلاً، وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَه، وَلَا تَجْعَلْهُ مُلْتَبِسًا عَلَيْنَا فَنَضِلَّ (تفسیر ابن کثیر، 1/427)۔ یعنی اے اللہ، ہمیں حق کو حق کی صورت میں دکھا، اور اس کے اتباع کی توفیق دے، اور باطل کو باطل کی صورت میں دکھا، اور اس سے بچنے کی توفیق دے، اور اس کو ہمارے اوپر مبہم (ambiguous) نہ بنا کہ ہم گمراہ ہو جائیں۔ اسی طرح یہ دعا: اللَّهُمَّ أَرِنَا الْأَشْيَاءَ كَمَا هِيَ (تفسیر الرازی، جلد 13، صفحہ 37)۔ اے اللہ، مجھے چیزوں کو اسی طرح دکھا، جیسا کہ وہ ہیں۔

مطالعۂ حدیث

شرح مشکاۃ المصابیح

0001

عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اور آدمی کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس آدمی کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہو تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہے۔ اور جس آدمی کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کے لیے ہو یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہو تو اس کی ہجرت اسی چیز کے لیے ہے جس کی طرف اس نے ہجرت کی۔ (متفق علیہ)

ہر عمل کا ایک ظاہری نقشہ (form) ہوتا ہے۔ مگر کوئی عمل صرف اپنے نقشہ یا خارجی صورت کے اعتبار سے مطلوب نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر عمل کی قیمت اس داخلی کیفیت یا اس قلبی محرک کے اعتبار سے ہوتی ہے جو عمل کے وقت آدمی کے اندر پایا جائے۔ مثلاً ہجرت یا ترک وطن اگر کسی دنیوی مقصد کے لیے ہو تو آدمی کو صرف اس کا مطلوب دنیوی مقصد حاصل ہوگا۔ اور اگر اس کی ہجرت کسی دینی مقصد، مثلاً حق کی اشاعت کے لیے ہو تو ایسی صورت میں آدمی کو حق کی اشاعت کا انعام دیا جائے گا۔

0002

عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ایک دن جب کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، اچانک ایک آدمی ہمارے سامنے آیا، بہت سفید کپڑوں والا اور بہت سیاہ بالوں والا۔ اس کے اوپر سفر کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اور ہم میں سے کوئی شخص اس کو پہچانتا نہ تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے گھٹنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنے سے ملا دیے۔ اور اپنے دونوں ہاتھ آپ کے دونوں زانو پر رکھ دیے۔ اور کہا کہ اے محمد، مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے۔ آپ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرو۔ اور زکوۃ ادا کرو۔ اور رمضان کے روزے رکھو۔ اور بیت اللہ کا حج کرو اگر اس کی استطاعت

رکھتے ہو۔ آنے والے آدمی نے کہا کہ آپ نے درست فرمایا۔ ہم کو اس آدمی پر تعجب ہوا کہ وہ پوچھتا بھی ہے اور تصدیق بھی کرتا ہے۔ آنے والے نے کہا کہ مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے۔ آپ نے فرمایا: یہ کہ تم ایمان رکھو اللہ پر اور فرشتوں پر اور اللہ کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر اور تم ایمان رکھو تقدیر پر، اس کے خیر پر اور اس کے شر پر۔ آنے والے نے کہا کہ آپ نے درست فرمایا۔ آنے والے نے کہا کہ اب مجھے احسان کے بارے میں بتائیے۔ آپ نے فرمایا: یہ کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو، پس اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ آنے والے نے کہا: اب مجھے قیامت کے بارے میں بتائیے۔ آپ نے فرمایا کہ پوچھا جانے والا اس معاملہ میں پوچھنے والے سے زیادہ باخبر نہیں۔ آنے والے نے کہا کہ پھر اس کی نشانیوں کے بارے میں بتائیے۔ آپ نے فرمایا، یہ کہ لونڈی اپنے آقا کو جنم دے۔ اور تم دیکھو کہ ننگے پاؤں، ننگے بدن والے مفلس، بکریوں کو چرانے والے، عمارتوں پر فخر کر رہے ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ پھر آنے والا چلا گیا۔ میں کچھ دیر وہاں ٹھہرا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اے عمر، کیا تم جانتے ہو کہ یہ آنے والا آدمی کون تھا۔ میں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ جبریل تھے۔ وہ آئے تا کہ تم کو تمہارا دین سکھائیں (مسلم)۔

یہ حدیث کسی تشریح کے بغیر واضح ہے۔ اس میں احسان کی بابت جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اعلیٰ عبادت وہ ہے جب کہ عبادت کے ساتھ گہری معرفت شامل ہو جائے۔ عابد کے اندر خدا کی موجودگی (presence) کا اتنا شدید احساس ہو گویا کہ وہ اس کو براہ راست دیکھ رہا ہے۔ اگر کسی کے اندر یہ اعلیٰ معرفت موجود نہ ہو تو دوسرے درجہ میں یہ ہونا چاہیے کہ اس کو بالواسطہ معرفت کا درجہ حاصل ہو۔ اگر قلبی احساس کے اعتبار سے اس کو خدا کی قربت حاصل نہیں ہے تو وہ سوچ کے اعتبار سے اس کا تصور اپنے ذہن میں قائم کرے۔

اس حدیث میں اللہ رب العالمین کی موجودگی (presence of God) کے دو درجے بتائے گئے ہیں۔ ایک ہے، کیفیت کے درجے میں اللہ رب العالمین کی معرفت، اور دوسرا ہے، علم کے درجے میں یہ سوچ پیدا ہونا کہ میں اگرچہ اللہ کا مشاہدہ نہیں کر سکتا، لیکن اللہ خود اپنے مقام سے مجھ کو

دیکھ رہا ہے۔ وہ مجھ سے کامل طور پر باخبر ہے۔

اسی طرح قیامت کا معاملہ یہ ہے کہ جن چیزوں کو اس حدیث میں قیامت کی ابتدائی نشانی بتایا گیا ہے۔ وہ علامتیں اگر ظاہر ہو جائیں تو انسان کو کم سے کم یہ کرنا ہے کہ وہ قیامت کے معاملے میں چوکنا ہو جائے۔ وہ مزید اضافے کے ساتھ قیامت کے بارے میں سوچنے لگے۔

0003

مذکورہ حدیث (0002) کو ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کسی قدر اختلاف کے ساتھ روایت کیا ہے۔ اس میں ہے کہ "اور جب تم دیکھو ننگے پاؤں، ننگے بدن، بہرے اور گونگے زمین کے بادشاہ ہیں۔ قیامت ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کے بارے میں خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔ پھر آپ نے قرآن کی آیت (31:34) تلاوت فرمائی: بیشک اللہ ہی کو قیامت کا علم ہے اور وہی بارش برساتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ رحم میں ہے۔ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کمائی کرے گا۔ اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔ بیشک اللہ جاننے والا، باخبر ہے (متفق علیہ)۔

اس روایت میں قیامت کی پیشگی نشانیاں بتائی گئی ہیں۔ لوگوں کا شاندار عمارتیں بنا کر ان پر فخر کرنا اور عوام کا بادشاہ بن جانا۔ یہ دونوں نشانیاں دراصل صنعتی دور کی پیشین گوئی ہیں۔ جدید صنعتی ترقیوں کے بعد دنیا میں ایک نیا انقلاب آیا ہے جس کو اقتصادی انفجار (economic explosion) کہا جاسکتا ہے۔ اس انقلاب نے ہر ایک کے لیے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ وہ اپنے لیے پرفخر عمارتیں کھڑی کر سکے۔ اسی طرح جدید انقلابات کے نتیجہ میں وہ چیز ظہور میں آئی ہے جس کو ڈیموکریسی کہا جاتا ہے۔ اس نے پہلی بار یہ کیا کہ عوام کو حاکمیت کا حق دے دیا، جب کہ اس سے پہلے وہ شاہی خاندان کا حق سمجھا جاتا تھا۔

0004

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ یہ گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور یہ کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اور نماز قائم کرنا۔ اور زکاۃ ادا کرنا۔ اور حج کرنا۔ اور رمضان کے روزے رکھنا (متفق علیہ)

اسلام کے پانچ ارکان جو حدیث میں بتائے گئے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا ایک

ظاہری فارم (form) ہے۔ شہادت کی ظاہری صورت زبان سے کلمہ کے الفاظ کی ادائیگی ہے۔ اسی طرح نماز اور زکاۃ اور حج اور روزہ کی ظاہری صورتیں ہیں جو کہ معلوم ہیں۔ اسی کے ساتھ ان میں سے ہر ایک کی ایک اسپرٹ یا داخلی کیفیت ہے۔ کلمہ کی داخلی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کو شعوری دریافت کے درجہ میں اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبری کی معرفت حاصل ہوجائے۔ اسی طرح نماز کی حقیقت عجز اور خشوع ہے۔ زکاۃ کی حقیقت دوسرے انسانوں کے حق میں نفع بخشی ہے۔ حج کی حقیقت سارے اہل ایمان کا ایک فکری مرکز سے جڑ جانا ہے۔ روزہ کی حقیقت صبر ہے۔ یہ پانچ چیزیں گویا پانچ روحانی قدریں (spiritual values) ہیں۔ انھیں پانچ خصوصیات کے مجموعے سے وہ زندگی بنتی ہے جس کو اسلامی زندگی کہا جاتا ہے۔

0005

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان کی 70 سے زیادہ شاخیں ہیں۔ ان میں سے اعلیٰ چیز یہ کہنا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور سب سے ادنیٰ یہ ہے کہ آدمی راستے کی تکلیف دہ چیز ہٹا دے اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔ (متفق علیہ)

ایک آدمی کو جب ایمان کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو اس کی زندگی کے ہر بڑے اور چھوٹے شعبہ میں اس کا اثر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اللہ کی نسبت سے اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ اس کا سینہ اللہ کی صفاتِ کمال کے احساس سے بھر جاتا ہے۔ انسان کے لیے اس کا خیر خواہی کا جذبہ یہاں تک پہنچتا ہے کہ وہ نامعلوم راہ گیروں کی راہ کی رکاوٹوں کو بھی دور کرنے لگتا ہے۔ اس کی حساسیت اتنی زیادہ بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنی غلطی پر شرمندہ ہو اور صرف اس وقت مطمئن ہو جب کہ وہ اپنی غلطی کی تلافی کر لے۔

0006

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلم وہ ہے جس کی زبان سے اور جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہیں۔ اور مہاجر (وطن چھوڑنے والا) وہ ہے جو اس چیز کو چھوڑ دے جس سے اللہ نے منع فرمایا ہے (البخاری)۔ اور صحیح مسلم کی روایت میں یہ ہے کہ

ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ مسلمانوں میں کون بہتر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں (مسلم)۔

ایک شخص جب سنجیدہ طور پر اور شعوری فیصلہ کے ساتھ اسلام کو اختیار کرتا ہے تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس کی زندگی بدل جاتی ہے۔ اب وہ ایک بااصول انسان بن جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے ماتحت سمجھنے لگتا ہے، نہ کہ اس سے آزاد۔ یہ تبدیلی اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے ہاتھ کا استعمال ذمہ دارانہ طور پر کرے۔ اپنی زبان سے دوسروں کو دکھ پہنچانا یا اپنی طاقت کا بے جا استعمال کرنا اس کو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے کہ یہ دوسروں کے خلاف اقدام نہیں ہے بلکہ خود اپنے خلاف اقدام ہے۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ ایسا ہر فعل اس کو خدا کی پکڑ کا مستحق بنا دے گا۔

ہجرت محض ایک مقام کو چھوڑ کر دوسرے مقام پر جانے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے غیر مطلوب روش کو چھوڑ کر مطلوب روش اختیار کرنے کا نام ہے۔ ہجرت کا انعام اسی شخص کو ملے گا جو ہر اس چیز کو چھوڑ دے جس سے خدا نے منع فرمایا ہے۔

0007

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک (مکمل) ایمان والا نہیں جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ میں اس کے لیے اس کے باپ اور اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو جاؤں (متفق علیہ)۔

ایمان کا یہ فطری نتیجہ ہے کہ آدمی کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان ایک عظیم نعمت ہے جو کسی آدمی کو گمراہی کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لاتا ہے۔ جو اس کو جہنم کے راستوں سے ہٹا کر جنت کے راستوں پر گامزن کرتا ہے۔ ہدایت کی یہ نعمت کسی آدمی کو براہِ راست آسمان سے نہیں ملتی بلکہ پیغمبر خدا کے ذریعہ سے ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سچا مومن یہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کے پیغمبر کا اس کے اوپر عظیم ترین احسان ہے۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کے بعد سب سے زیادہ اس کے رسول سے محبت کرے۔ اس کے سینہ میں پیغمبر خدا کی محبت کا لازوال چشمہ جاری ہو جائے۔

0008

انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین چیزیں جس آدمی کے اندر ہوں وہ ایمان کی لذت کو پالے گا۔ جس کے لیے اللہ اور رسول تمام دوسری چیزوں سے زیادہ محبوب ہوجائیں۔ جو کسی بندے سے صرف اللہ کے لیے محبت کرے۔ جو کفر کی طرف دوبارہ لوٹنے کو اتنا ہی ناپسند کرے جتنا کہ وہ آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے، جب کہ اللہ نے اس کو اس سے بچالیا (متفق علیہ)۔

ایمان یہ ہے کہ آدمی کو اس سچائی کی معرفت ہوجائے کہ اس دنیا میں خدا کا انکار سب سے بڑی محرومی ہے، اور خدا کا اقرار سب سے بڑی طاقت۔ ایسا ایمان جب کسی انسان کو دریافت کے درجہ میں حاصل ہوتا ہے تو وہ ایک مختلف انسان بن جاتا ہے۔ اس کے لیے سب سے زیادہ محبوب خدا اور رسول بن جاتے ہیں۔ اور اس کے لیے سب سے ناپسندیدہ چیز یہ ہوجاتی ہے کہ وہ دوبارہ سچائی سے محروم ہو کر اس صورتِ حال سے دوچار ہوجائے جس میں وہ پہلے مبتلا تھا۔ اس احساس کی خارجی علامتوں میں سے ایک علامت یہ ہے کہ انسانوں سے اس کی محبت اور خیرخواہی تمام تر اسی ایمانی محبت کے تابع ہوجاتی ہے۔

0009

عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس شخص نے ایمان کا مزہ چکھا جو اللہ کو اپنا رب بنانے پر راضی ہوگیا۔ اور اسلام کو اپنا دین بنانے پر اور محمد کو اپنا رسول بنانے پر (مسلم)۔ انسان پیدائشی طور پر سچائی کا متلاشی ہے۔ کسی انسان کی تلاش جب اس کو ایمان تک پہنچاتی ہے تو یہ واقعہ اس کے لیے سب سے بڑی طلب کو پالینے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ وہ خدا کو اور خدا کے رسول کو اور خدا کے دین کو اپنے دل کی گہرائیوں میں اس طرح اتار لیتا ہے جیسے کہ اس کو کوئی بے حد لذیذ چیز مل گئی ہو۔

0010

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس

کے قبضے میں میری جان ہے۔ کوئی بھی یہودی یا نصرانی جو میرے پیغام کو سنے پھر وہ مرجائے اور وہ اس پر ایمان نہ لایا ہو جس کو دے کر مجھے بھیجا گیا ہے تو وہ آگ والوں میں سے ہوگا۔(مسلم)

پیغمبر اسلام کے بعد اب کسی کے لیے نجات کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ وہ آپ پر ایمان لائے اور آپ کی بتائی ہوئی تعلیم پر عمل کرے۔ اب پچھلے مذاہب کی آسمانی کتابیں صرف گزری ہوئی تاریخ کا حصہ ہیں، نہ کہ خود انسانوں کے لیے خدا کے دین کا ماخذ۔ کیوں کہ پچھلے نبیوں کی تعلیمات اب صرف محرف (distorted) صورت میں باقی ہیں، جب کہ پیغمبر اسلام کا لایا ہوا دین ہر قسم کی تحریف سے مکمل طور پر پاک ہے۔ دین خداوندی کے غیر محرف ایڈیشن کی موجودگی میں اس کا محرف ایڈیشن اپنے آپ غیر معتبر ہوجاتا ہے۔

0011

ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین قسم کے لوگ ہیں جن کے لیے دوہرا اجر ہے۔ اہل کتاب میں سے وہ شخص جو اپنے نبی پر ایمان رکھتا تھا پھر وہ محمد پر ایمان لایا۔ اور وہ مملوک غلام جو اللہ کا حق ادا کرے اور اسی کے ساتھ اپنے آقاؤں کا بھی۔ اور وہ آدمی جس کے پاس ایک باندی ہو جس سے وہ تمتع کرتا تھا پھر اس نے اس کی تربیت کی اور اچھی تربیت کی۔ اور اس نے اس کی تعلیم دی اور بہتر تعلیم دی۔ پھر اس نے اس کو آزاد کیا اور اس سے نکاح کرلیا (متفق علیہ)۔

آدمی ایک کام کو جائز اور درست سمجھ کر اس میں مشغول ہو۔ تو وہ اس سے پوری طرح مانوس ہوجاتا ہے۔ اس کے لیے کسی نئی نیکی کو دریافت کرنا اور اس کو عملاً اختیار کرنا بظاہر ایک مشکل کام بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں جو آدمی اپنے مانوس دائرہ سے نکل کر ایک اور نیکی کو دریافت کرے اور اس کو اپنی زندگی میں شامل کرے اس نے گویا حق کے راستے میں دوہری منزلیں طے کیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے آدمی کے لیے دوہرا انعام مقرر کیا گیا ہے۔

اللہ کی مدد

فطرت کا ایک قانون قرآن میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ (47:7)۔یعنی اے ایمان والو، اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا۔

اس حقیقت کو ایک حدیثِ رسول میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:احْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ احْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ تُجَاهَكَ (مسند احمد، حدیث نمبر 2669)۔یعنی اللہ کی حمایت کرو، اللہ تمھاری حفاظت کرے گا، اللہ کی حمایت کرو، تم اس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔وفی روایۃ:احْفَظِ اللّٰهَ يُكْرِمْ مَا بِكَ (الإبانة لابن بطة، حدیث نمبر 1504)۔یعنی، اللہ کی حمایت کرو، اللہ تم کو عزت عطا کرے گا۔

اللہ کی مدد یا اللہ کی حمایت کا مطلب ہے، اللہ کے مشن کو اپنا مشن بنانا، اور اپنی جان و مال کی طرح بلکہ ان سے بڑھ کر خدائی مشن کی حفاظت و اشاعت کرنا۔اصل یہ ہے کہ واقعات کو ظہور میں لانے والا خدا ہے۔مگر وہ واقعات کو اسباب کے پردہ میں ظہور میں لاتا ہے۔یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ باطل کا زور ختم ہو اور حق کو دنیا میں استحکام حاصل ہو۔مگر اس واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے اللہ تعالیٰ کو کچھ ایسے افراد درکار ہیں جو اس خدائی عمل کا انسانی پردہ (human face) بنیں۔یہی وہ معاملہ ہے جس کو یہاں خدا کی نصرت کرنا کہا گیا ہے۔

مجھے اپنی زندگی کا ایک واقعہ یاد آتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے دین کی مدد کے معاملے میں خدا کی مدد کی حقیقت کیا ہے۔غالباً 1948 کا واقعہ ہے۔اس کو میں نے اپنی کتاب "قرآن کا مطلوب انسان" میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے:ضلع اعظم گڑھ کے رُوواں نامی بستی کے باہر ایک باغ کے پاس کھلے میدان میں جماعت اسلامی کا ضلعی ماہانہ اجتماع ہو رہا تھا۔ظہر کا وقت تھا۔اذان ہو چکی تھی، ایک بڑے درخت کے نیچے فرش بچھا ہوا تھا، جہاں کچھ لوگ سنتیں پڑھ رہے تھے، اور کچھ لوگ نماز کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔اتنے میں ایک حادثہ پیش آیا۔اجتماع کے قریب ایک بڑا سا گڑھا تھا، جس

کے عین کنارے سے راستہ گزرتا تھا۔ اس راستہ پر ایک بیل گاڑی جارہی تھی۔ جیسے وہ گڑھے کے کنارے پہنچی، اس کا ایک پہیہ پھسل گیا، اور پوری گاڑی کروٹ ہوکر گڑھے میں اس طرح گرگئی کہ ایک پہیہ اوپر کھڑا تھا، اور دوسرا نیچے دبا ہوا تھا۔ جیسے ہی ہم میں سے کچھ لوگوں کی نظر اس پر پڑی، وہ اس کی مدد کے لیے دوڑ پڑے۔ گاڑی سامان سے لدی ہوئی تھی۔ بیل بھی گاڑی میں پھنسے ہوئے تھے۔ بظاہر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ چند لوگ اس مسئلہ کو حل کیسے کرسکیں گے۔ مگر یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا، بلکہ فی الفور اقدام کرنے کا وقت تھا۔ مدد کے لیے آنے والے فوراً بچاؤ کے کام میں لگ گئے۔ کچھ نے نیچے سے زور لگایا، اور کچھ نے اوپر سے پکڑ کر گاڑی کو اٹھانا شروع کیا۔ میں ان لوگوں کے ساتھ تھا، جو گاڑی کو نیچے سے اٹھانے کی کوشش کررہے تھے۔

اس کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ یکا یک ہم نے دیکھا کہ گاڑی اٹھا کر اوپر رکھ دی گئی ہے۔ چند آدمی جو اس کام میں لگے تھے، ان سب کا متفقہ احساس تھا کہ گاڑی ہم نے نہیں اٹھائی، بلکہ وہ تو کسی اور نے اٹھا کر رکھ دی ہے۔ نیچے ہاتھ دینے والوں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اوپر سے کوئی اس کو کھینچے چلا جارہا ہے، اور جو لوگ اوپر تھے ان کو ایسا محسوس ہورہا تھا گویا گاڑی نیچے سے اٹھتی چلی آرہی ہے۔

یہ واقعہ واضح (illustrate) کرتا ہے کہ خدا کی مدد کا مطلب کیا ہے۔ یہ میری زندگی کا ایک حقیقی تجربہ تھا۔ اس سے میں نے دریافت کیا کہ خدا کی نصرت کیسے آتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ دنیا میں خدا کی جو مدد آتی ہے، وہ ہمیشہ اسباب کے پردے میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو اپنی استطاعت کے مطابق پوری تدبیر کرنی پڑتی ہے۔ یعنی کام کو انجام دینے والے بظاہر ہیومن فیس (human face) ہوتے ہیں، لیکن باعتبار حقیقت وہ منصوبہ اصلاً فرشتوں کے ذریعے انجام پاتا ہے ۔کیوں کہ یہ فرشتے ہیں، جو اللہ کے حکم سے ساری دنیا کا نظام چلا رہے ہیں۔

اب اگر کچھ انسان زمانی مواقع کے اعتبار سے خدا کے منصوبہ کو دریافت کریں، اور اس کے لیے جدو جہد کریں تو عین اسی وقت یہ ہوگا کہ خدا کے فرشتے خصوصی طور پر وہاں آکر اس انسان کی مدد کریں گے۔ یہی مطلب ہے انسان کی جانب سے خدا کی نصرت کا، اور خدا کی جانب سے انسان کی مدد کا۔

مستقبل کی دنیا

Emerging New World

موجودہ زمانے میں دو مختلف آئڈیالوجی اُبھری— سیکولر آئڈیالوجی اور مذہبی آئڈیالوجی۔ سیکولر آئڈیالوجی سے مراد وہ آئڈیالوجی ہے جو خالصتاً انسانی عقل (reason) کی بنیاد پر بنائی گئی ہے۔ اِس کے مقابلے میں مذہبی آئڈیالوجی ہے، یعنی انسانی اضافوں سے پاک خدائی دین، جو پیغمبر کی رہنمائی کے تحت بنی۔ موجودہ زمانے کا یہ ایک عجیب ظاہرہ ہے کہ سیکولر آئڈیالوجی اب اپنی مایوسی کے آخری دور میں پہنچ رہی ہے۔ اِس کے برعکس، تمام قرائن (clues) بتارہے ہیں کہ مذہبی آئڈیالوجی نئی صبح کی مانند انسان کے اوپر طلوع ہونے والی ہے، بلکہ وہ طلوع ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

جدید مادّی ترقیوں کے بعد سیکولر مفکرین نے یہ یقین کرلیا کہ بہت جلد ہمارے سیّارۂ زمین (planet earth) پر وہ بہتر دنیا بننے والی ہے، جس کا خواب ہزاروں سال سے انسان دیکھتا رہا ہے۔ اِس آئڈیالوجی کی ایک نمائندہ کتاب فیوچر شاک (Future Shock) ہے، جس کو اُس کے مصنف الون ٹافلر (Alvin Toffler) نے پہلی بار 1970 میں شائع کیا۔ یہ کتاب شائع ہوتے ہی بیسٹ سیلر بن گئی۔ اِس کتاب میں مصنف نے یقین کے ساتھ یہ پیشین گوئی کی تھی کہ دنیا تیزی کے ساتھ انڈسٹریل ایج سے ترقی کرکے سُپر انڈسٹریل ایج میں داخل ہونے والی ہے۔ یہ سویلائزیشن کا اعلیٰ ترقی یافتہ مرحلہ ہوگا، جب کہ انسان کی تمام مادّی خواہشیں اپنا مکمل فلفل مینٹ (fulfillment) پالیں گی۔

مگر اکیسویں صدی کا آغاز اِس قسم کے تمام اندازوں کے خاتمے کے ہم معنی بن گیا۔ اب شدت کے ساتھ وہ ظاہرہ پیدا ہوا جس کو گلوبل وارمنگ کہا جاتا ہے۔ انڈسٹریل سرگرمیوں سے پیدا ہونے والی آلودگی (pollution) نے سیارۂ زمین پر ایسے حالات پیدا کیے، جب کہ یہ دنیا انسان کے لیے قابلِ رہائش (habitable) ہی نہیں رہے گی۔ میڈیا میں مسلسل یہ خبریں آرہی ہیں کہ تمام دنیا کے سائنس دانوں نے گہری ریسرچ کے بعد یہ پایا ہے کہ ہماری زمین میں موسمیاتی تبدیلی (climatic change) اِس خطرناک حد تک پہنچ گئی ہے کہ اب وہ ناقابلِ تبدیلی (irreversible) ہو چکی ہے۔

یہ سائنس کی زبان میں قیامت کی پیشین گوئی ہے، یعنی زمین پر موجودہ حالات کا خاتمہ اور ایک نئی تاریخ کا آغاز۔ نئی دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (18 نومبر 2007) نے گلوبل وارمنگ کے موضوع پر ایک رپورٹ شائع کی تھی۔ اِس رپورٹ کے عنوان کے لیے اُس نے بامعنی طور پر اِن الفاظ کا انتخاب کیا تھا— قیامت اب زیادہ دور نہیں:

Doomsday not Far

یہ صورتِ حال ایک طرف سیکولر آئڈیالوجی کو منسوخ کررہی ہے، اور دوسری طرف وہ ہم کو یہ قرینہ (clue) دے رہی ہے کہ اِس معاملے میں مذہبی آئڈیالوجی زیادہ درست اور مبنی بَر حقیقت ہے۔ مذہبی آئڈیالوجی جو پیغمبروں کے ذریعے معلوم ہوئی، وہ یہ ہے کہ موجودہ سیارۂ زمین اِس لیے بنایا ہی نہیں گیا کہ یہاں انسان اپنے لیے مادی جنت کی تعمیر کرسکے۔ یہاں کے ناقص اسباب یقینی طور پر کسی مفروضہ مادی جنت کی تعمیر میں رکاوٹ ہیں۔

اِس معاملے میں درست اور مطابقِ واقعہ بات یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے تمام اسباب، امتحانی پرچے (test papers) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ موجودہ دنیا میں جو چیزیں انسان کو ملی ہیں، وہ بطور انعام نہیں ہیں۔ اگر یہ چیزیں بطور انعام ہوتیں تو وہ اپنی ذات میں کامل ہوتیں۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، یہاں کی ہر چیز ناقص ہے اور اِن چیزوں کا ناقص ہونا یہ بتاتا ہے کہ یہی نظریہ درست ہے کہ یہ چیزیں امتحانی پرچے کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ انسان کو انعام کے طور پر نہیں دی گئیں۔

یہ قرینہ (clue) یہ ثابت کرتا ہے کہ اِس معاملے میں پیغمبرانہ نظریہ ہی صحیح نظریہ ہے، یعنی یہ کہ موجودہ دنیا غیر معیاری دنیا (imperfect world) ہے۔ اِس کے بعد ایک اور دنیا بنے گی جو اِس دنیا کا معیاری ورژن (perfect version) ہوگا۔ موت کے بعد بننے والی اِس معیاری دنیا میں وہ لوگ جگہ پائیں گے جو موجودہ امتحانی دنیا میں اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرچکے ہوں۔

اِس معاملے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ تمام سیکولر فلسفی اور مفکر اور سماجی رہنما ہزاروں سال سے یہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ وہ موجودہ دنیا میں منصفانہ سماج (just society) بنائیں، مگر ساری

کوششوں کے باوجود اُنھیں کامیابی نہ ہوسکی۔ برعکس طور پر یہ ہوا کہ ساری دنیا میں انارکی اور کرپشن اور استحصال (exploitation) اور بددیانتی پھیل گئی۔ موجودہ ترقی یافتہ دور میں اِس معاملے میں مزید اضافہ ہوا۔ حتی کہ تمام قرائن کے مطابق، اب یہ ناممکن ہو چکا ہے کہ منصفانہ سوسائٹی کی تعمیر کے مقصد کو حاصل کیا جاسکے۔ جدید ترقیوں نے لوگوں کے بگاڑ میں صرف اضافہ کیا، اِس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ انسان کا ضمیر ایک منصفانہ سماج چاہتا ہے۔ یہ ضمیر کبھی ختم نہ ہوسکا۔ یہ ضمیر جس طرح پہلے لوگوں کے اندر موجود تھا، اُسی طرح وہ آج بھی پایا جاتا ہے۔ اب موجودہ حالات میں منصفانہ سماج کا قیام عملاً ناممکن ہو چکا ہے۔ مثلاً موجودہ عدالتی نظام اتنا زیادہ بگڑ چکا ہے کہ اُس سے اب انصاف کی امید ہی نہیں کی جاسکتی۔ قوانین کی بھرمار کے باوجود صرف بے انصافیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔

یہ معاملہ دوبارہ ایک قرینہ (clue) ہے جو پیغمبرانہ تصور کی تائید کرتا ہے، یعنی یہ کہ مجرموں کو سزا دینا اور سچے انسانوں کو اُن کے کیے کا انعام دینا، موجودہ محدود دنیا میں ممکن ہی نہیں۔ انسانی ضمیر کے اِس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ایک اور دنیا درکار ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں خود خدا ظاہر ہو کر سب کا حساب لے اور انصاف کو قائم کرے۔ یہ صورتِ حال اِس پیغمبرانہ تصور کی تائید کرتی ہے کہ موت کے بعد ایک یومُ الحساب (Day of Judgement) آنے والا ہے۔ اُس وقت خدائی طاقت کے ذریعے منصفانہ سماج کا وہ قیام ممکن ہو جائے گا، جو انسانی طاقت کے ذریعے موجودہ دنیا میں ممکن نہیں ہوا تھا۔

پیغمبرانہ آئڈیالوجی کے مطابق، انسانی زندگی کے دو دَور ہیں— قبل از موت دورِ حیات، اور بعد از موت دورِ حیات۔ اب یہ آخری طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ قبل از موت دورِ حیات اپنی محدودیتوں کی وجہ سے اُس کامل دنیا کی تعمیر کے لیے ناکافی ہے جو انسان کا ضمیر چاہتا ہے۔ یہ مطلوب دنیا بلاشبہ بنے گی، لیکن وہ موت کے بعد کے وسیع تر دورِ حیات ہی میں بن سکتی ہے— یہ مطلوب دنیا ایک زیرِ تعمیر دنیا (world in the making) ہے۔ اب وہ دن زیادہ دور نہیں، جب کہ یہ بننے والی مطلوب دنیا مکمل ہو کر ہمارے سامنے آجائے۔

ذہن سازی، بزورنفاذ

عائشہ بنت ابی بکر (وفات 58ھ) کو اسلام کی تاریخ میں خاتونِ اوّل (First Lady) کا مقام حاصل ہے۔ وہ خلیفۂ اوّل ابوبکر صدیق کی صاحبزادی تھیں پھر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ بنیں۔ وہ قرآن کی ایک بڑی عالمہ تھیں۔ علم حدیث میں ان کو مجتہدانہ مقام حاصل تھا۔

عائشہ صدیقہ کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس طویل عرصہ تک انتہائی قریبی صحبت کا موقع حاصل ہوا۔ چنانچہ انھوں نے بہت سی گہری حکیمانہ باتیں دریافت کیں، ان میں سے ایک یہ ہے۔ عائشہ صدیقہ کہتی ہیں کہ قرآن میں سب سے پہلے وہ سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت اور جہنم کا ذکر تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے (حَتَّى إِذَا ثَابَ النَّاسُ إِلَى الْإِسْلَامِ) تو حرام اور حلال کے احکام اترے۔ اور اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ تم لوگ شراب نہ پیو تو ضرور وہ کہتے کہ ہم شراب نہ چھوڑیں گے اور اگر یہ اترتا کہ تم لوگ زنا نہ کرو تو ضرور وہ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے (لاَ نَدَعُ الْخَمْرَ أَبَدًا وَ لاَ نَدَعُ الزِّنَا أَبَدًا) صحیح البخاری، حدیث نمبر 4993۔

مذکورہ روایت میں بے حد اہم بات بتائی گئی ہے۔ یہ روایت بتاتی ہے کہ معاشرہ کی اصلاح کے لیے اسلام کا طریقہ کیا ہے۔ یعنی وہ طریقہ جس کے ذریعہ کسی معاشرہ میں مثبت اور حقیقی نتائج برآمد کیے جاسکتے ہیں اور انسانی معاشرہ میں حقیقی انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ وہ طریقہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ پہلے فکری مہم کے ذریعہ افراد کے ذہن کو بدلنا اور پھر قبولیت کے بعد اجتماعی سطح پر احکامِ شریعت کو نافذ کرنا۔

عجیب بات ہے کہ یہ حقیقت عائشہ صدیقہ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سالہ صحبت میں جان لی تھی اور امت کو اس سے باخبر کر دیا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اور مفکرین سارے قرآن وحدیث کو پڑھنے کے باوجود اس اہم حقیقت سے بےخبر رہے اور اب تک بےخبر ہیں۔ وہ ایک کے بعد ایک مسلم ملکوں میں اقتدار پر قبضہ کر کے اچانک اسلامی شریعت کے نفاذ کی کوشش کررہے ہیں۔ مگر ہر بار یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ لوگ، عائشہ صدیقہ کے الفاظ میں، یہ کہہ کر شرعی احکام

قبول کرنے سے انکار کردیتے ہیں— ہم (اپنی پرانی روش) کبھی نہ چھوڑیں گے۔ اس ناکامی کا سبب یقینی طور پر یہی ہے کہ ذہن سازی کا کام کیے بغیر شرعی احکام کو نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔

معاشرہ کی اصلاح کا نقطۂ آغاز (starting point) کیا ہے۔ اس کو پیغمبر اسلام کے واقعہ سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ہجرت سے پہلے جب آپ مکہ میں تھے تو وہاں کے سرداروں نے آپ کو حکومت کی پیش کش کی۔ انھوں نے کہا کہ اگر تم اس کے ذریعہ سے عزت چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا سردار بنالیں گے اور اگر حکومت چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا حاکم بنانے کے لیے تیار ہیں (وَإِنْ كُنْتَ تُرِيدُ مُلكًا مَلَّكْنَاكَ عَلَيْنَا)۔ آپ نے فرمایا: میں تمھارے اوپر حکومت نہیں چاہتا۔ لیکن اللہ نے مجھے تمھاری طرف بطور رسول بھیجا ہے (وَلَكِنَّ اللّٰهَ بَعَثَنِي إِلَيْكُمْ رَسُولًا) سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 63-262۔ دوسرے الفاظ میں، تم لوگ میری بات سنو، اور خدا پر ایمان لاؤ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس جواب سے اسلامی تحریک کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اسلامی تحریک کا نقطۂ آغاز حکومت یا سیاسی اقتدار نہیں ہے، بلکہ اسلامی تحریک کا اصل نقطۂ آغاز فرد کی شخصیت میں تبدیلی لانا ہے، ایک ایک فرد کے ذہن کی تشکیل نو (re-engineering of the mind) کرنا ہے۔ اسلامی تحریک کا فارمولا دو نکات (points) پر مشتمل ہے— فرد کی شخصیت میں تبدیلی لانا، اور پولٹکل سسٹم کے معاملے میں حالتِ موجودہ کو تسلیم کرلینا:

Change in personality, status quoism in political system

اسلامی تحریک کی یہی فطری ترتیب ہے۔ اگر اِس ترتیب کو بدل دیا جائے، یعنی اگر پولٹکل سسٹم کو بدلنے سے تحریک کا آغاز کیا جائے تو سو سال کی جدوجہد کے بعد بھی کوئی مثبت نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ فرد کی تبدیلی سے آغاز کرکے نظام کی تبدیلی تک پہنچنا ممکن ہوتا ہے۔ لیکن اگر نظام کی تبدیلی سے آغاز کیا جائے تو ایسی تحریک کسی انجام تک پہنچنے والی نہیں۔ ایسی تحریک صرف تباہی میں اضافہ کرے گی، اِس کے سوا اور کچھ نہیں— حقیقت یہ ہے کہ ہر قسم کے بگاڑ کا تعلق سوچ سے ہے۔ اصلاح کا راز یہ ہے کہ انسانی سوچ میں تبدیلی لائی جائے۔ انسانی سوچ کو بدلے بغیر کوئی بھی اصلاح ممکن نہیں۔

ایک سوال

افغانستان میں طالبان اقتدار حاصل کرنے کے بعد یہ اعلان کررہے ہیں کہ وہ اسلامی قانون نافذ کریں گے۔ اِس کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ (ایک قاری الرسالہ، دہلی)

جواب

موجودہ زمانے میں افغانستان کے مسئلہ کو بہت بڑا مسئلہ سمجھا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ صرف اِس لیے پیدا ہوا کہ وہاں کے مسلم لیڈروں نے دانشمندی کا طریقہ اختیار نہیں کیا، نہ مذہبی لیڈروں نے اور نہ سیکولر لیڈروں نے۔ اگر افغانستان میں سیاسی معاملے میں خیر الشّرّین (دو برائیوں میں سے کمتر برائی) کو اختیار کرنے کا اصول اپنایا جاتا تو یہ مسئلہ بہت پہلے ختم ہو چکا ہوتا۔ یعنی سیاسی معاملے میں اسٹیٹس کوازم کا طریقہ اختیار کرنا، اور اپنی توانائی کو تخریب کے بجائے تعمیر میں لگانا۔

صحیح البخاری (حدیث نمبر 4993) میں حضرت عائشہ کا بیان ذکر کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دلوں کو بدلا، اس کے بعد شرعی قانون پر عمل کرنے کا حکم دیا۔ دلوں کو بدلنا یعنی ذہن سازی کرنا۔ افغانستان کے طالبان اِس کے برعکس، بم اور گن اور بندوق وغیرہ کے ذریعے اسلامی قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ یہی فرق یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ طالبان اسلامی قانون کے نفاذ میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ وہ اپنی انتہا پسندانہ اور متشددانہ کاروائیوں کے ذریعے افغانستان میں جو چیز لائیں گے، وہ صرف تباہی ہوگی۔ وہ نہ کوئی دینی تربیت کر سکیں گے اور نہ کوئی مادی تعمیر۔

ذہن سازی کے بغیر اگر قانون نافذ کیا جائے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے، اس کو ذیل کے واقعہ سے سمجھا جاسکتا ہے۔ انڈیا کے مشہور انگریزی صحافی مسٹر خشونت سنگھ (1915-2014) نے لکھا ہے کہ میں ہندستان سے پاکستان گیا۔ جب ہمارا ہوائی جہاز لاہور کی فضا میں پہنچا تو جہاز میں اناؤنسر نے اعلان کیا کہ پاکستان میں شراب ممنوع ہے۔ کوئی مسافر شراب کی بوتل کے ساتھ پاکستان میں داخل نہیں ہوسکتا۔ آپ لوگوں میں سے جس شخص کے پاس شراب ہو وہ اس کو جہاز کے عملے کے

پاس جمع کردے۔ مسٹر خشونت سنگھ نے لکھا ہے کہ میرے پاس شراب کی ایک بوتل تھی۔ یہ بوتل میں نے حسبِ اعلان ہوائی جہاز کے عملے کے حوالے کر دیا۔ مگر اس کے بعد جب میں لاہور کے اندر داخل ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ بلیک مارکیٹ میں شراب نہایت فراوانی کے ساتھ بک رہی ہے، اور میں بلیک سے جتنی چاہے شراب خرید سکتا ہوں۔

یہ واقعہ میں نے ایک عالم دین کو سنایا، اور کہا کہ موجودہ زمانے میں جن مسلم ملکوں میں شراب بند کی گئی ہے، وہاں اس کا یہی انجام ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے لوگوں کا ذہن بنایا اس کے بعد شراب کی حرمت کا اعلان کیا (مسند احمد، حدیث نمبر 8620)۔ اسی طرح موجودہ زمانے میں پہلے اس کے موافق ذہنی فضا بنانی پڑے گی۔ محض قانون کے زور پر لوگوں کو شراب نوشی سے روکا نہیں جا سکتا۔

انھوں نے کہا کہ مگر یہ طریقہ ہم کو اسلاف کے یہاں نہیں ملتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک ہزار سال تک قانون ہی کے زور پر شراب کو روکا جاتا رہا۔ ایسا نہیں کیا گیا کہ پہلے ذہنی فضا بنائی جائے اس کے بعد شراب پر پابندی لگائی جائے۔

میں نے کہا کہ پچھلے زمانے پر موجودہ زمانہ کو قیاس کرنا صحیح نہیں۔ اس لیے کہ پچھلا زمانہ وہ ہے، جب کہ اسلامی روایات کا تسلسل برابر جاری تھا۔ مگر موجودہ زمانے میں اسلامی روایات کا تسلسل یکسر ٹوٹ گیا ہے۔ اب دوبارہ وہی ضرورت پیش آ گئی ہے، جو رسول اللہ کے زمانے میں تھی۔ اب ہمیں دوبارہ اسلامی روایات قائم کرنی پڑیں گی، اس کے بعد ہی قانون کا نفاذ مفید ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ قانون ہمیشہ روایات کے زور پر نافذ ہوتا ہے، اور موجودہ زمانے میں شراب بندی کے قانون کے لیے روایات کا زور موجود نہیں ہے۔

اسلامی مشن کا نشانہ فرد (individual) کو ربانی انسان بنانا ہے، نہ کہ نظام (system) کو۔ اسلام کا مقصد انسان کا تزکیہ کرکے اس کو جنتی انسان بنانا ہے، نہ کہ سسٹم کو اسلامائز کرنا۔ مثلاً تقویٰ، معرفت، دعوت، حسنِ اخلاق، خیر خواہی، وغیرہ کا ذہن انسان کے اندر پیدا کرنا۔ جب انسان کے اندر یہ ذہن پیدا ہو جائے تو وہ خود بخود دوسرے اسلامی احکام کو مان لیتا ہے، جیسا کہ شراب کی حرمت کے واقعہ سے ثابت ہوتا ہے۔

ڈائری 1986

18 جنوری 1986

میری ڈائری میں 2 جولائی، 1983 کی تاریخ میں ایک لحاتی تجربہ ان الفاظ میں لکھا ہوا ہے:
آج میں صبح کے وقت دہلی میں اپنے کمرہ کے باہر سورج کی روشنی میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ اچانک میرے اوپر وہ تجربہ گزرا، جو گویا ایک حدیث قدسی کی تصدیق تھی۔

یہ قدسی حدیث الفاظ کے کچھ اختلاف کے ساتھ حدیث کی کئی کتابوں میں بیان کی گئی ہے ۔مثلاً صحیح البخاری، مسند احمد وغیرہ۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ تعالی نے فرمایا: مَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ، فَأَكُونَ أَنَا سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، وَلِسَانَهُ الَّذِي يَنْطِقُ بِهِ، وَقَلْبَهُ الَّذِي يَعْقِلُ بِهِ (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر 7833)۔ یعنی، میرا بندہ برابر نوافل کے ذریعہ میرے قریب ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہو، پس میں اس کا سمع (کان) بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اور اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اور اس کی زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے، اور اس کا دل بن جاتا ہوں، جس سے وہ سمجھتا ہے۔

اس حدیث میں انھی ایمانی کیفیات کو الفاظ کی شکل میں بتایا گیا ہے جو ایک مومن بندے پر گزرتے ہیں۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ جیسے ایک لمحہ کے لیے میرا دیکھنا میرے لیے، بلاتشبیہ، خدا کا دیکھنا بن گیا ہے۔ مگر یہ تجربہ میرے لیے خدا کی ذات پر یقین میں اضافہ کا ذریعہ بن گیا۔ میں نے کہا کہ خدایا، میں اپنے عاجز مطلق ہونے اور تیرے قادر مطلق ہونے کا اقرار کرتا ہوں اور تیری ساری صفات پر کامل یقین رکھتا ہوں۔ یہ رمضان 1403ھ کی 21 تاریخ تھی۔ اس دن شام کو میں نے افطار کرتے ہوئے پانی پیا۔ ٹھنڈا شفاف پانی جب میرے حلق سے گزرا تو مجھ پر ایک عجیب لحاتی احساس طاری ہوا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پانی کا گھونٹ میرے لیے ہدایت میں تبدیل ہو گیا۔ پانی کا حلق سے اترنا میرے لیے ہدایت اترنے کے ہم معنیٰ بن گیا۔ پانی اور ہدایت میرے اندر تھوڑی دیر کے لیے ایک ہو گئے۔

ایک صاحب سے ان تجربات کا ذکر ہوا۔ انہوں نے کہا کہ یہ وہی ڈاکٹر سی وی رمن

(وفات 1970ء) والا معاملہ ہے۔ نوبل انعام یافتہ سائنس داں ڈاکٹر رمن سے کسی نے کہا کہ سائنس دانوں کی دریافتوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اکثر اتفاقاً ہوئی ہیں۔ سائنس داں تجربات کرتا رہتا ہے کہ اتفاق سے کوئی چیز سامنے آجاتی ہے اور وہ ایک نئی دریافت بن جاتی ہے۔ ڈاکٹر رمن نے جواب دیا— ہاں، مگر ایسا اتفاق صرف سائنس دانوں ہی کو پیش آتا ہے:

But it only happens to scientists

یہ تجربات اگرچہ لمحاتی ہوتے ہیں۔ مگر یہ لمحات اسی شخص پر گزرتے ہیں جو برسوں سے اپنی زندگی اسی رخ پر لگائے ہوئے ہو۔

20 جنوری 1986

ایک اخبار میں آزادی سے پہلے کی ایک رپورٹ پڑھی کہ 1945 میں جنرل شاہ نواز خان (1914-1983)، کرنل پریم سہگل (1917-1992)، اور کرنل گربخش سنگھ ڈھلوں (1914-2006) گرفتار ہوئے تھے۔ ان پر برطانوی راج کے خلاف بغاوت کا الزام تھا۔ اس کے بعد مقدمہ چلا جس میں وہ رہا ہو گئے۔ لال قلعہ سے رہائی کے بعد صبح سویرے وہ لاہور اسٹیشن پہنچے۔ یہ 1946 کا واقعہ ہے۔ اس روز لاہور اسٹیشن پر اتنی زبردست بھیڑ تھی جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ لاہور اسٹیشن کی طرف جانے والی تمام سڑکیں ان لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں جو سہگل، ڈھلوں اور شاہ نواز کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ جب گاڑی پلیٹ فارم پر رکی تو عوام نے نعرہ لگایا:

لال قلعہ سے آئی آواز   سہگل ڈھلوں شاہ نواز

تینوں ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ ریل کے ڈبے سے باہر آئے۔ دوسرے ہی لمحے آزاد ہند فوج کے ان جیالوں کو پھولوں کے ہاروں سے اس طرح لاد دیا گیا کہ وہ پھولوں کے تین ڈھیر دکھائی دینے لگے۔ سہگل، ڈھلوں، شاہ نواز، ہندوستان میں ہندو، سکھ، مسلم اتحاد حاصل کرنے کے مضبوط ارادے کے علامت تھے۔ ''ہندو مسلم سکھ اتحاد'' آزادی سے پہلے کے ہندوستان میں جتنا بامعنیٰ لگتا تھا آج وہ اتنا ہی بے معنی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی سے پہلے سب کا نشانہ خارجی اقتدار تھا۔ آزادی کے بعد سب کا نشانہ داخلی مخالفت بن گیا۔ جو لوگ خارجی نشانہ پر متحد تھے وہ داخلی نشانہ پر آتے ہی ایک

دوسرے سے جدا ہو گئے۔ صرف جدا نہیں ہوئے بلکہ آپس میں لڑنے لگے—اس دنیا میں وہی تحریک کامیاب ہوسکتی ہے جو انقلاب سے پہلے بھی تعمیری نشانہ دیتی ہو اور وہ انقلاب کے بعد بھی لوگوں کو تعمیری نشانہ دے۔ ایسی تحریک صرف وہی ہوسکتی ہے جو آخرت کی بنیاد پر اٹھائی جائے۔

21 جنوری 1986

20 جنوری 1986 کی صبح کو میں انڈین ایئر لائنز کی فلائٹ نمبر 439 کے ذریعے دہلی سے حیدرآباد گیا اور 21 جنوری کی شام کو فلائٹ نمبر 539 سے واپسی ہوئی۔ دہلی سے حیدرآباد جاتے ہوئے جہاز کے اندر حسب معمول اعلانات شروع ہوئے۔ اناؤنسر نے دوسری باتوں کے ساتھ کہا— کیپٹن مصطفیٰ جہاز کے پائلٹ ہیں:

Captain Mustafa is in command

انڈین ایئر لائنز میں، میں نے بہت سفر کیے ہیں۔ مگر ''کیپٹن مصطفیٰ'' جیسا لفظ پہلی بار سننے میں آیا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ مسلمان اب اس ملک کی اعلیٰ سروسوں میں داخل ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ وہ تاریک ماضی سے نکل کر روشن مستقبل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

جن لوگوں کے پاس مسلمانوں کے بارے میں صرف ''نکالے جانے'' کی خبریں ہیں، انہیں ''داخل کیے جانے'' کی خبروں کا بھی اظہار کرنا چاہیے تا کہ لوگوں کو تصویر کا دوسرا رخ معلوم ہو سکے۔ ہندوستان کے مسلم لیڈر ملک کے اندر اور ملک کے باہر صرف ایک ہی بات کرنا جانتے ہیں اور وہ تعصب اور امتیاز ہے۔ وہ تصویر کے دوسرے رخ کا مطلق ذکر نہیں کرتے۔ قرآن کے الفاظ میں یہ لوگ مطففین ہیں اور خدا کے قانون میں مطففین کے لیے ہلاکت ہے، نہ کہ نجات۔

اس سفر میں حیدرآباد میں ایک تجربہ گزرا جس کے بعد میری زبان پر یہ الفاظ تھے: اس دنیا میں آدمی کو مستقبل کی خاطر ماضی کو بھولنا پڑتا ہے۔ یہاں آدمی کو سبھی کچھ چھوڑنا پڑتا ہے تا کہ وہ دوبارہ پا سکے۔ یہاں رکنا پڑتا ہے تا کہ از سر نو آگے بڑھنے کا راستہ کھلے۔ یہاں دینا پڑتا ہے تا کہ دوبارہ اضافہ کے ساتھ مل سکے۔ یہاں چپ رہنا پڑتا ہے تا کہ آدمی کو بولنے کے لیے الفاظ مل سکیں۔ یہ دنیا کھو کر پانے کی جگہ ہے۔ یہاں دے کر لیا جاتا ہے۔

اس سفر میں میرا ایک اور تاثر یہ ہے: یہ ممکن ہے کہ آپ کسی چیز پر بلا استحقاق قبضہ کر لیں مگر یہ ناممکن ہے کہ آپ کسی چیز پر اپنے بلا استحقاق قبضہ کو باقی رکھ سکیں۔

22 جنوری 1986

ایک مقام کے مسلمان نے بتایا کہ ان کے یہاں عید گاہ کی بنیاد ڈالی جارہی تھی اور اس موقع پر بستی میں شیرینی تقسیم ہونے والی تھی۔ مذکورہ مسلمان نور محمد نے اپنے ایک ہندو پڑوسی سے کہا کہ تم بھی چلو اور اپنے حصے کی شیرینی حاصل کرو۔ ہندو نے عذر کیا۔ بار بار پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہم نے سنا ہے کہ تم لوگ مسجد اور عید گاہ کی نیو میں گائے کی سینگ ڈالتے ہو اور اس کا بال اس کے اندر دفن کرتے ہو۔ ایسی حالت میں ایک ہندو کیسے وہاں جا سکتا ہے۔ اس نے مزید کہا کہ عید گاہ کا مطلب ہم کو بتایا گیا ہے ''عید گائے''۔ یعنی جس کی بنیاد میں گائے دفن کی جائے وہ عید گاہ ہے۔ ایک اور مسلمان نے بتایا کہ مسجد میں اذان ہو رہی تھی۔ موذن نے کہا کہ ''اللہ اکبر، اللہ اکبر''۔ یہ سن کر ایک ہندو بولا: میاں جی، اکبر بادشاہ تو کب کا مر گیا، ابھی تک تم لوگ اسی کو پکارے جارہے ہو۔

یہ باتیں بظاہر بہت لغو معلوم ہوتی ہیں۔ مگر اس کی ذمہ داری کم از کم 50 فیصد خود مسلمانوں پر بھی ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کا حقیقی تعارف اس ملک کی بڑی آبادی کے سامنے پیش نہیں کیا، مگر اپنی جھوٹی سیاست سے ہزاروں انسان کے دلوں میں نفرت پیدا کی۔ اسی کی وجہ سے ان کے درمیان ایسے قصے مشہور ہوئے۔ جب دو قوموں میں نفرت ہو تو اسی طرح جھوٹی باتیں ایک دوسرے کے خلاف پنپنے لگتی ہیں۔

1947 سے پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ ایک کانگریسی مسلمان نے ایک مضمون شائع کیا۔ یہ مضمون اصلاً ادب کے موضوع پر تھا۔ مگر اس میں ضمناً انگریزی تہذیب کا بھی مذاق اڑایا گیا تھا۔ مضمون نگار نے لکھا تھا کہ انگریزی زبان ایسی بری زبان ہے کہ اس میں جا کر سیدھے الفاظ بھی بگڑ جاتے ہیں۔ مثلاً الہ آباد انگریزوں کی زبان میں آل بیڈ (Allahbad) بن جاتا ہے اور لالہ ان کی زبان میں پاپی (Poppy) کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

دوسروں کے بوائق (شر) سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی سب سے آسان تدبیر یہ ہے کہ اپنے بوائق سے دوسروں کو محفوظ رکھا جائے۔ اس معاملہ میں شکایت اور احتجاج سے کوئی فائدہ نہیں۔

23 جنوری 1986

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بربادی کی واحد سب سے بڑی وجہ ان کا جھوٹا فخر ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان دوسروں سے پیچھے ہو گئے۔ وہ دور جدید میں ترقی کی بنیاد کھو بیٹھے۔ مگر شاعروں اور خطیبوں نے انہیں جھوٹے فخر کی غذا دے کر مدہوشی میں مبتلا کر دیا۔ ظفر علی خان نے مولانا حالی کے خلاف بہت سی نظمیں لکھی تھیں۔ ایک بار انہوں نے لکھا:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے　　　میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

حالی چونکہ پانی پت کے رہنے والے تھے اسی لیے ردیف وقافیہ ملا کر ان کے خلاف ایک شعر تیار ہو گیا۔ انہی ظفر علی خاں کا ایک شعر ہے:

چلے ہم لکھنؤ سے بارہ بنکی　　　مسلماں سیر ہیں ہندو چھٹنکی

حقیقت کے اعتبار سے معاملہ اس شعر کے بالکل برعکس ہے۔ مگر بارہ بنکی اور چھٹنکی (چھٹانک بھر، معمولی، حقیر) کا قافیہ شاعر کے لیے کافی ہو گیا کہ وہ حقیقت واقعہ کے خلاف ایک بات ثابت کر کے لوگوں سے خراج تحسین حاصل کر سکے۔

24 جنوری 1986

برادرم جناب محسن عثمانی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے ایک صاحب کا تاثر بیان کیا۔ یہ تاثر انہیں کے الفاظ میں یہ تھا— ''دوسرے علما کی تحریروں سے اسلاف پر اعتماد پیدا ہوتا ہے اور وحید الدین خاں کی تحریروں سے اسلاف پر بے اعتمادی پیدا ہوتی ہے''۔

میں نے کہا کہ یوں نہ کہیے۔ بلکہ اس طرح کہیے— ''دوسرے علما کی تحریریں اسلاف تک پہنچا کر چھوڑ دیتی ہیں اور وحید الدین کی تحریریں آدمی کو آگے خدا تک لے جاتی ہیں''۔

دور زوال میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ قومیں خدا سے کٹ کر اپنے افراد پر اٹک جاتی ہیں۔ وہ اپنے بزرگوں میں جینے لگتی ہیں۔ بزرگوں کا تذکرہ، بزرگوں کی عظمت سے فخر کا جذبہ لینا، بزرگوں کی کہی ہوئی باتوں سے وابستہ ہو جانا، یہی بعد کے لوگوں کا دین ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں جب ان کے سامنے براہ راست خدا کی بڑائی بیان کی جاتی ہے اور ان کو براہ راست قرآن وسنت کی طرف بلایا جاتا

ہے تو ایسے لوگ اس قسم کی باتوں سے اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ ایسا دین ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ میں اپنی تحریروں میں اپنی ذات کی طرف نہیں بلاتا بلکہ خدا کی طرف بلاتا ہوں۔ پھر لوگوں کو کیوں یہ احساس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی غلطی ہے۔ کیا خدا کی طرف بلانا بھی ایسی چیز ہے جس میں کوئی غلطی ہو؟

25 جنوری 1986

آج پرنسپل نفیس احمد صدیقی (نظام الدین ایسٹ) تشریف لائے۔ ان کے پاس السٹریٹڈ ویکلی (دسمبر 1985) کی کاپیاں تھیں جن میں مسٹر ارون شوری (پیدائش 1941) نے مسلم پرسنل لا پر تین قسطوں میں مضمون شائع کیا ہے اور شاہ بانو کیس کے سلسلے میں سپریم کورٹ کے فیصلے کو درست ثابت کیا ہے۔ سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ شاہ بانو کو طلاق کے بعد ان کا شوہر پانچ سو روپے ماہانہ مستقل گزارہ دے۔

میں نے کہا کہ اس معاملے میں رائے قائم کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک نقلی، دوسرا عقلی۔ نقلی اعتبار سے طلاق کے بعد گزارہ دینے کا اصول قطعاً ثابت نہیں ہوتا۔ قرآن اور حدیث میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ تمام فقہا اس پر متفق ہیں کہ طلاق سے پہلے عورت کے لیے نفقہ ہے اور طلاق کے بعد عورت کے لیے متاع۔

شریعت میں نفقہ کا لفظ مینٹیننس (Maintenance) کے لیے ہے اور متاع کا لفظ پراوزن (Provision) کے لیے۔ مگر ایک مولوی آدمی مینٹیننس کو وقتی رقم اور پراوزن کو مستقل گزارہ کے معنی میں بولے تو انگریزی داں طبقہ اس کا مذاق اڑائے گا۔ مگر عربی الفاظ (نفقہ اور متاع) کے سلسلے میں انگریزی داں حضرات یہی غلطی کر رہے ہیں۔ وہ قرآن سے متاع کا لفظ لیتے ہیں اور اس کو اس مفہوم میں استعمال کرتے ہیں جس کے لیے شریعت میں نفقہ کا لفظ آیا ہے۔

دوسری بات میں نے یہ کہی کہ عقلی معیار پر ان حضرات کا نقطۂ نظر درست ثابت نہیں ہوتا۔ جدید مغربی دنیا نے اس اصول کو اختیار کیا کہ مرد پر لازم ہے کہ وہ طلاق کے بعد بھی اپنی سابقہ بیوی کو گزارہ دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی سوسائٹی میں پچاس فیصد سے زیادہ لوگ بے نکاح

عورتوں کے ساتھ رہنے لگے تاکہ علیحدگی کی صورت میں وہ عورت کو گزارہ دینے کے قانون سے بچ جائیں۔ یہ تجربہ ثابت کرتا ہے کہ طلاق کے بعد گزارہ کو لازم قرار دینا مسئلہ کو ختم نہیں کرتا بلکہ وہ مسئلہ کو اور بڑھا دیتا ہے۔

26 جنوری 1986

عبداللہ مصطفی صاحب ایک امریکی نومسلم ہیں۔ ان کا سابق نام اسٹیو اسکلر تھا اور ان کا سال پیدائش 1947 ہے۔ انہوں نے 1969 میں اسلام قبول کیا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد وہ گیارہ سال تک مختلف مسلم ملکوں کا سفر کرتے رہے۔ اسی درمیان میں انہوں نے عربی اتنی سیکھ لی کہ وہ عربی زبان میں بخوبی گفتگو کر سکتے ہیں۔ وہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں سے بے حد شاکی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ مسلم ملکوں کا سفر کرنے کے بعد آپ کا آخری تاثر کیا تھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ (مسلمانوں کو دیکھ کر) میں بہت زیادہ دل شکستہ ہو گیا تھا، یہاں تک کہ مجھے خیال ہونے لگا کہ میں اسلام سے نکل جاؤں گا:

کنت محزوناً جداً حتی ظننت ان اخرج من الاسلام

ان کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا اصل مرض پیرانوئیا (paranoia) ہے۔ یعنی جھوٹی بڑائی کا جنون۔ مسلمان فرضی طور پر اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں اور جب دنیا ان کی فرضی بڑائی کو تسلیم نہیں کرتی تو وہ ساری دنیا کے خلاف جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر ایک کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔

وہ اردو نہیں جانتے، اس لیے ہمارے لٹریچر سے براہ راست واقفیت حاصل نہیں کر سکتے۔ تاہم کئی ملاقاتوں میں، میں نے اپنے لٹریچر کا خلاصہ ان کے سامنے رکھا۔ وہ بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ کے جو افکار ہیں انہی افکار پر مبنی لٹریچر آج مغربی قوموں میں اسلام کے تعارف کے لیے درکار ہے۔

انہوں نے کہا کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب شہید وغیرہ کی کتابوں کے ترجمے انگریزی زبان میں کیے گئے ہیں، مگر وہ مغرب میں اس کی تبلیغ کے لیے کارآمد نہیں۔ کیونکہ ان میں اسلام کو قومی فخر کے انداز میں پیش کیا گیا ہے، نہ کہ اس اصولی اور فطری انداز میں جیسے کہ آپ پیش کرتے ہیں۔

داعیانہ کردار

سی پی ایس انٹرنیشنل، نئی دہلی کی چیرپرسن ڈاکٹر فریدہ خانم نے سی پی ایس لیڈیز ٹیم کے ایک آن لائن پروگرام میں مندرجہ ذیل تقریر کی تھی:

مولانا وحید الدین خاں صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ " دعوت الی اللہ کا مشن اختیار کرنے کے لیے داعیانہ کردار ضروری ہے۔ جو شخص دعوتی عمل کا کریڈٹ لینا چاہتا ہو، اُس پر لازم ہے کہ وہ اپنے اندر داعیانہ کردار پیدا کرے"۔ ہم داعیانہ کردار کو رسول اللہ ﷺ اور اصحابِ رسول کے نمونہ سے بہت اچھے طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔ رسول اللہ کے زمانے میں بار بار ایسا ہوتا تھا کہ مدعو غصہ ہو جاتے تھے۔ لیکن آپ اور آپ کے اصحاب اعراض کا طریقہ اختیار کرتے تھے۔

مثال کے طور پر مصعب بن عمیر خدا کا پیغام پہنچانے مدینہ گئے تھے۔ وہاں قبیلہ اوس کے ایک بڑے سردار اسید بن حضیر کو جب ان کی دعوتی سرگرمیوں کی خبر ہوئی تو بہت غصہ ہوئے کہ تم ہماری عورتوں اور ہمارے بچوں کو بہکانے آئے ہو (فَوَقَفَ عَلَيْهِمَا مُتَشَتِّمًا، فَقَالَ: مَا جَاءَ بِكُمَا إِلَيْنَا تُسَفِّهَانِ ضُعَفَاءَنَا)۔ مصعب بن عمیر نے بہت ٹھنڈے طریقے سے جواب دیا کہ پہلے آپ تھوڑی دیر بیٹھ کر میری بات سنیں، پھر اس کے بعد آپ جو فیصلہ کریں وہ مجھے منظور ہوگا۔ اسید بن حضیر نے کہا کہ تم نے بہت انصاف کی بات کہی اور سننے کے لیے بیٹھ گئے۔ اس کے بعد مصعب بن عمیر نے قرآن کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے اس کے بعد کہا: 'یہ کلام کتنا عمدہ اور کتنا اچھا ہے' (مَا أَحْسَنَ هَذَا الْكَلَامَ وَأَجْمَلَهُ)، اور وہ مصعب بن عمیر کے ساتھی بن گئے (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 436)۔ اس طرح بہت جلد مدینہ کے تمام باشندے آپ کے فولڈ میں آگئے۔

یہی سارے صحابہ کا طریقہ تھا، وہ غصے کا جواب غصے سے نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ وہ اس بات کے بہت زیادہ حریص تھے کہ خدا کے بندوں کو خدا کا پیغام پہنچایا جائے۔ اگر وہ غصہ کا طریقہ اختیار کرتے تو حالات دعوتی عمل کے لیے نارمل نہ ہو پاتے۔ اس وجہ سے وہ ہر موقع پر اوائڈنس کا طریقہ اختیار کرتے تھے، اور آخری حد تک صبر و برداشت کے اصول پر قائم رہتے تھے۔

رسول اللہ کے زمانے میں اس قسم کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف علاقوں میں تبلیغی وفود بھیجے تھے۔ مثلاً آپ نے اپنے دو صحابہ حضرت ابوموسی اور حضرت معاذ بن جبل کو اسلام کی تبلیغ کے لیے یمن بھیجا۔ ان دونوں کو بھیجتے ہوئے آپ نے یہ نصیحت کی: ''تم لوگ آسانی پیدا کرنا مشکل پیدا نہ کرنا، تم لوگ خوش خبری دینا، لوگوں کو متنفر نہ کرنا (یَسِّرَا وَلاَ تُعَسِّرَا، وَبَشِّرَا وَلاَ تُنَفِّرَا)'' صحیح البخاری، حدیث نمبر 3038۔ انھوں نے انتہائی نرمی سے لوگوں سے بات چیت کی۔ تمام لوگ متاثر ہوگئے، اور پیغمبر اسلام کے سچے ساتھی بن گئے۔

لیکن موجودہ دور میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ میری ایک دوست بتا رہی تھیں کہ انھوں نے اپنے بچے کے لیے ایک مولوی صاحب کو لگایا کہ وہ ان کو دین اسلام کی باتیں بتائیں۔ لیکن وہ آتے ہی بچوں کو جہنم سے ڈرانے لگے، ان کو ڈوز اینڈ ڈونٹز (do's and don'ts) کی زبان میں دین کی باتیں بتانے لگے۔ یہ بچے انگلش اسکول کے پڑھنے والے تھے، ان کو اس قسم کی باتیں سمجھ میں نہیں آئیں، انھوں نے مولوی صاحب سے پڑھنے سے انکار کردیا۔ اگر مولوی صاحب ان کو پیراڈائز کی باتیں بتاتے، دین کی باتوں کو ریزن آؤٹ کرکے بتاتے تو ان کے اندر دلچسپی پیدا ہوتی، اور وہ مولوی صاحب کی باتوں کو سمجھتے۔ تو یہی وہ حکمت ہے، جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ تم لوگ آسانی پیدا کرو، مشکل پیدا نہ کرو، لوگوں کو خوشخبری دو، ان کو متنفر نہ کرو۔

اسلام دین فطرت ہے، وہ ہر آدمی کی فطرت کی آواز ہے۔ اسلام کو قابلِ قبول بنانے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ لوگوں سے معتدل تعلقات قائم کیے جائیں۔ اور اسلام کے مثبت پیغام سے انھیں باخبر کردیا جائے۔ قرآن کی سورہ الاحزاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے دعوت کے آداب بتائے گئے ہیں۔ اس کا ایک جزء یہ ہے: ''ان کے ستانے کو نظر انداز کرو، اور اللہ پر بھروسہ رکھو، اللہ بھروسے کے لیے کافی ہے (وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ وَكَفَى بِاللَّهِ وَكِيلًا) 33:48۔''

اس آیت کے مطابق، جب کوئی آدمی دعوتی کام کرے گا تو ضرور ایسا ہوگا کہ مدعو کی طرف

سے زیادتیاں پیش آئیں گی۔ داعی کے لیے ضروری ہے کہ ان زیادتیوں کو نظر انداز کرے۔ مدعو اگر ہماری دعوت کو سن کر ردِعمل کا اظہار کرتا ہے تو اسے اعراض کرتے ہوئے ہمیں اپنی دعوتی مہم کو جاری رکھنا ہے۔

قرآن کی سورہ طٰہٰ آیت 44 میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالی نے جب حضرت موسی کو فرعون کی طرف اپنے پیغام کے ساتھ بھیجا تو ان کو بطور خاص یہ حکم دیا تھا: ''پس اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔'' اب آپ سوچیے کہ ایسا جابر اور ڈکٹیٹر حکمراں، جس نے سب سے بڑا رب ہونے کا دعوی کیا تھا۔ اس نے کہا تھا: أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَى (79:24)۔ یعنی، میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں۔ اس کے بارے میں بھی اللہ تعالی کہہ رہے ہیں کہ اس سے نرمی سے بات کرنا، جب کہ اللہ تعالی کے علم میں سب کچھ تھا کہ وہ سرکش ہے اور خدا کے پیغام کو ماننے والا نہیں، پھر بھی اللہ نے اس کے ساتھ نرمی اختیار کرنے کا حکم دیا۔

لٰہذا داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کو بہت زیادہ یاد کرے اور وہ یہ سمجھ کر دعوت کا کام کرے کہ وہ خدا کا کام کر رہا ہے۔ تو خدا کے کام میں اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچے، کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ ری ایکٹ نہیں کرے گا، وہ ہر حال میں خوشی خوشی کام کرے گا کہ اس نے اپنے رب کے لیے کام کیا ہے۔ اگر آسانی سے کام ہو جاتا تو اس کا اتنا ثواب نہیں ہوتا۔ لیکن جب اس کے لیے کچھ مصیبت اٹھانا پڑے، کچھ تکلیف اٹھانا پڑے تو اس کا ثواب بہت زیادہ ہوگا۔

نرمی اس لیے ہے کہ مدعو بھی انسان ہی ہے، اس کا غصہ جو دکھائی دیتا ہے وہ اس کا اوپری اوپری رویہ ہوتا ہے، اس کی اندرونی فطرت میں وہ صلاحیت موجود رہتی ہے کہ کوئی حق بات اگر معقول انداز میں کہی جائے تو اس کی فطرت اس کو مجبور کرے گی کہ وہ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرے۔ اس کے برعکس، اگر ہم بھی غصہ ہونے لگیں، ہم بھی اپنے ایگو سے مغلوب ہو کر کوئی ردعمل ظاہر کریں تو مدعو کا کانشنس نہیں جاگے گا، تاکہ وہ ایک ریشنل اور لاجیکل بات کو مان لے جو اس کی فطرت کی آواز ہے۔ اس کو ایک ضد ہو جائے گی، اور وہ بات کو نارمل طریقے سے نہیں لے پائے گا۔

ایک بار میں نئی دہلی کے ایک پارک میں گئی، جس کا نام لودھی گارڈن ہے۔ وہاں میں نے قرآن اور لٹریچر ایک سردار جی اور ان کی فیملی کو دینا چاہا۔ سردار جی نے سختی سے کہا کہ ہم کیوں لیں آپ کی کتاب، کیا آپ ہماری کتاب پڑھتی ہیں۔ ہم نے کہا کہ ہم ہر چیز پڑھتے ہیں آپ دیجیے۔ پھر انھوں نے کہ آپ 'ست سری اکال' کہیں گے۔ ہم نے کہا کہ ہاں ہم کہیں گے، ہم نے دہرا دیا۔ اسی طرح سے انھوں نے اپنے مذہب کی کئی باتیں پوچھیں، اب وہ مجھے یاد نہیں، میں نے نرم انداز میں سب کا جواب دیا۔ وہ لوگ بہت خوش ہو گئے۔ سب نے ہماری کتابیں بہت خوشی خوشی لیں۔

قرآن کی سورہ النساء میں پیغمبر اسلام سے خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جو تمھارے مخالفین ہیں، تم ان سے اعراض کرو اور ان کو نصیحت کرو، اور ان سے ایسی بات کہو جو ان کے دلوں میں اتر جائے (4:63)۔ "مخالفین سے اعراض کرو" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بحیثیتِ انسان ان کو کمتر سمجھ کر نظر انداز کرو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی مخالفت پر ری ایکٹ نہ کرو۔ یعنی مخالفت کا منفی اثر نہ لو۔ اور اگر تم نے ذرا بھی بحث ومباحثہ کیا تو ڈسکشن کا موضوع بدل جائے گا۔ اسی لیے اپنے موضوع پر قائم رہنے کے لیے ہمیں اعراض کرنا چاہیے، اسی وجہ سے بہت زیادہ اعراض کی تلقین کی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل اعراض کرتے تھے، آپ کے صحابہ اعراض کرتے تھے۔ اِس کے لیے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اپنی انا (ego) کو کنٹرول کیا جائے۔ اس کے بعد دعوت کے باقی سارے آداب خود بخود پیدا ہو جائیں گے۔

قرآن کی سورہ النحل میں ارشاد ہوا ہے کہ "اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اچھے طریقے سے بحث کرو" (16:125)۔ بحث (جدال احسن) کا مطلب ہے ڈسکشن اور ڈائلاگ۔ اچھے طریقے سے بحث کرو، یعنی اگر وہ غیر ضروری بحث کریں تب بھی تمہارا انداز نرم رہے۔ وہ ٹیڑھی بات کریں، تب بھی اس کا جواب سیدھے طریقے سے دیا جائے۔ ان کے سخت الفاظ سن کر بھی اپنی زبان سے نرم الفاظ نکالنا ہے۔ اگر دوسرا پرووک (provoke) کرنا چاہے تو بھی داعی کو پرووک نہیں ہونا ہے۔ یہ داعی کا کردار ہے کہ مدعو کی طرف سے پیش آنے والی ہر

تکلیف پر صبر کرے۔ مدعو سے حساب چکانے کے بجائے ایسے تمام معاملات کو خدا کے خانے میں ڈال دے۔ جو انسان صحیح معنی میں اللہ سے ڈرنے والا ہوتا ہے اس کے اندر یہ کردار پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کو یہ گہرا یقین ہوتا ہے کہ یہ خدا کا پیغام ہے اور وہ خدا کے لیے یہ کام کر رہا ہے تو اس کو ہر حالت میں اس کام کو بحسن خوبی انجام دینا ہے۔

ہر پیغمبر نے یہی کہا کہ میں تمہارے لیے ناصح ہوں اور امین ہوں۔ ناصح کا لفظی مطلب ہے خیر خواہ، اور امین کا مطلب ہے امانت دار۔ خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسرے کا ہمدرد ہو، وہ اس کا بھلا چاہنے والا ہو۔ منصوبۂ تخلیق کے مطابق، وہ تمام انسانوں کو پر امن انداز میں ہدایت پہنچانے کا حریص ہو۔ یہ خیر خواہی اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ مدعو کی منفی روش سے بے پرواہو کر یک طرفہ طور پر اس کی ہدایت کا حریص بنا رہے۔ چنانچہ داعی اپنی تنہائیوں میں مدعو کے لیے دعا کرتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ میں کون سا انداز اختیار کروں کہ میری بات مدعو کے لیے زیادہ سے زیادہ قابلِ فہم ہو جائے۔ یہ ساری چیزیں اسی وجہ سے ہیں کہ اس کے اندر انسانی ہمدردی کا بہت گہرا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ چیز اس کو مدعو کی زیادتیوں کو نظر انداز کرنے والا بناتی ہے۔ اگر مدعو کڑوا بول بولے تب بھی داعی میٹھا بول بولتا ہے۔ اس بات کو آپ اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ جیسے اپنا بچہ ہوتا ہے کتنا ہی غلط کام کرے تو اسے نرمی سے سمجھایا جاتا ہے، سختی نہیں کی جاتی ہے۔ کیونکہ ماں باپ کو بچوں سے جو گہرا تعلق ہوتا ہے وہ والدین کو مجبور کرتا ہے کہ وہ بہت نرمی سے اپنے بچے کو سمجھائیں، تاکہ بات اس کے دل میں اتر جائے۔

یہی معاملہ داعی اور مدعو کا ہے۔ داعی کے دل میں مدعو کی شفقت اتنی بڑھی ہوئی ہونی چاہیے کہ وہ کسی بھی حال میں مدعو سے نفرت نہ کرے۔ ہر حال میں وہ اس کی ہدایت کا حریص ہو، تنہائیوں میں وہ اس کے لیے دعا کرے۔ ایسی دعا ضرور قبول ہوتی ہے۔ ایسے بہت سے واقعات ہیں کہ دعا کرنے کے بعد جب دعوت دی گئی تو ان کے دل میں بات اتر گئی۔ مثلاً ابو ہریرہ کی ماں کا واقعہ جو صحیح مسلم (حدیث نمبر 2491) میں بیان کیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور صحابہ کی پوری زندگی میں طرح طرح کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ایک کتاب ہے حیاۃ الصحابہ، اس کے مصنف مولانا زکریا کاندھلوی صاحب ہیں۔ اس میں

صحابہ کے بہت سے واقعات ہیں، یعنی وہ کتنا زیادہ اس بات کے لیے بے چین رہتے تھے کہ لوگوں کو کیسے ہدایت کا پیغام پہنچایا جائے۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ خدا کا پیغام ہے اور اس کے پہنچانے پر ان کو خدا کے یہاں کتنا زیادہ اجر ملے گا۔ ان کے سامنے خدا اور اس کی جنت ہوتی تھی۔ اسی لیے وہ بے چین رہتے تھے کہ اس پیغام کو لوگوں تک ہر حال میں پہنچانا ہے۔

سادگی، سنسیر ٹی (sincerity)، ماڈسٹی (modesty) اور انسانی خیر خواہی اور لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا۔ یہ نمونے ہیں جو ہمیں صحابہ کی زندگیوں میں ملتے ہیں۔ اس کے لیے صرف یہ شرط ہے کہ داعی اپنی انا کو ختم کردے، تواضع کے ساتھ رہے، اور سادگی (simplicity) کا طریقہ اپنائے۔ صحابہ کرام نے اپنے زمانے میں دنیا کے بڑے حصے میں لوگوں کو اسلام کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ ان کی سادگی اور تواضع کو دیکھ کر لوگ متاثر ہوجاتے تھے۔ ان صفات کو ہمیں اپنی زندگی میں اپنانا ہوگا۔ ایک اچھا داعی بننے کے لیے یہ صفات نہایت ضروری ہیں۔ آج لوگ اپنے اور غیر (we and they) کی نفسیات میں جیتے ہیں۔ یہ روش خیر خواہی کی قاتل نفسیات ہے، یہ دعوتی عمل کے لیے انتہائی نقصان دہ روش ہے۔

ابتدائے اسلام میں جب مسلمان انڈیا آئے، تو وہ سب سے پہلے کیرالا آئے۔ وہاں انھوں نے قومی شناخت کے نام پر اپنے آپ کو مقامی آبادی سے الگ نہیں کیا، بلکہ وہ مقامی لوگوں سے مل جل کر رہے، یہاں تک کہ انھوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں بھی کیں۔ اس وجہ سے وہاں پر ان کے لیے خدا کا پیغام پہنچانا بہت آسان ہو گیا۔ اگر وہ اپنا الگ کلچر چلاتے، اپنے اور غیر کی نفسیات میں جیتے، جیسے آج کل مسلمان اپنا الگ کلچر چلاتے ہیں تو صحابہ قدیم دور میں دعوت کا کام نہیں کر پاتے۔ اپنے اور غیر کی نفسیات سے دوریاں بڑھتی ہیں۔ اس لیے ہمیں واپس جانا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور ان کے صحابہ کی زندگیوں کو جاننا ہے، وہاں سے اپنے لیے عملی نمونہ تلاش کرنا ہے۔ آج کے قومی رہنماؤں میں ایسی مثالیں نہیں ملیں گی۔ وہاں آپ کو حقیقی اسلام نہیں ملے گا۔ اس وجہ سے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو پڑھنا چاہیے، صحابہ کی زندگیوں کو پڑھنا چاہیے۔ اس سے آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ داعیانہ کردار کیا ہوتا ہے۔ (ڈاکٹر فریدہ خانم)

خبر نامہ اسلامی مرکز — 277

1- سی پی ایس انٹرنیشنل دہلی سے ہفتہ وار پروگرام کا سلسلہ جاری ہے جیسا کہ مولانا وحید الدین خاں صاحب کی حیات میں جاری تھا۔ یہ پروگرام اتوار کے دن ساڑھے دس بجے فیس بک (fb.com/maulanawkhan) پر لائیو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس میں ڈاکٹر فریدہ خانم اور ڈاکٹر ثانی اثنین خان خطاب کرتے ہیں۔ 5 جون 2022 کو ڈاکٹر ثانی اثنین خان صاحب نے " پیغمبر یوسف کے قصہ کا سبق " کے عنوان سے خطاب کیا۔

2- گڈورڈ بکس، نئی دہلی نے دنیا کی 30 سے زیادہ زبانوں میں تراجم قرآن کے علاوہ بریل ترجمۂ قرآن بھی شائع کیا ہے۔ سی پی ایس دہلی کے ممبر مسٹر محمد عمار نے 7 دسمبر 2021 کو بلائنڈ ریلیف ایسوسی ایشن، نئی دہلی کی لائبریری کے لیے ایک بریل قرآن بطور گفٹ دیا۔ تاکہ وہ لوگ بھی خدا کے پیغام سے باخبر ہوں، جو دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔

3- دعوت امت مسلمہ کا مشن ہے۔ یہ عمل شعوری منصوبہ بندی چاہتا ہے۔ شعوری منصوبہ بندی کا مطلب ہے دعوت کو اپنی زندگی میں شامل کرلیا جائے۔ اس تعلق سے یہاں ایک تجربہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ 21 اکتوبر 2021 شہر وانمباڑی (تمل ناڈو) سے ایک صاحب کا کال آیا۔ انھوں نے بتایا کہ علاج کے لیے میرا ایک غیر مسلم ڈاکٹر سے اپوائنٹمنٹ ہے اور میری خواہش ہے کہ میں انھیں انگریزی ترجمۂ قرآن دوں۔ اگر آپ کے پاس سعودی عرب کا انگریزی ترجمہ قرآن اویلیبل ہو تو برائے مہربانی مجھے ایک عدد دیجیے۔ یاددہانی کے لیے انھوں نے کئی مرتبہ فون بھی کیا۔ بہت تلاش کے بعد وہ ترجمۂ قرآن مل سکا۔ ویسے سی پی ایس انٹرنیشنل کی جانب سے کئی زبانوں میں تراجم قرآن دستیاب ہیں۔ مگر ان کے جذبے اور مطالبے کی قدر کرتے ہوئے میں سعودی عرب سے چھپے ہوئے قرآن کی تلاش میں تھا۔ جب مجھے یہ نسخہ مل گیا تو میں نے یہ کیا کہ گڈورڈ بکس سے طبع شدہ ترجمۂ قرآن بھی ساتھ لے گیا۔ اور سعودی والے ترجمۂ قرآن کے ساتھ میں نے سی پی ایس کے ترجمۂ قرآن کی ایک کاپی بھی ان کو دی۔ وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ سی پی ایس کا ترجمۂ قرآن ہینڈی اور بہت خوبصورت ہے۔ کیا اس کی مزید کاپیاں مجھے مل سکتی ہیں۔ میں نے اس ترجمۂ قرآن کی مزید کاپیاں اور وہاٹ از اسلام نامی کتاب ان کو دے دی۔

اس واقعہ سے میری سمجھ میں آیا کہ دعوت کی شعوری منصوبہ بندی کا مطلب کیا ہے۔ یعنی ہم دنیا میں جہاں کہیں بھی ہوں، علاج ہو یا تجارت یا کوئی اور معاملہ، غیر مسلموں سے ہمارا تعلق لازمی طور پر قائم ہوتا ہے۔ اگر پیشگی طور پر ہم کچھ پرنٹڈ دعوتی لٹریچر مثلاً ترجمہ قرآن، وغیرہ اپنے پاس رکھ لیں تو ہر مسلم اپنا دعوتی رول ادا کرسکتا ہے۔ کیوں کہ مدعو تک خدا کا پیغام، یعنی قرآن پہنچانا داعی کی ذمہ داری ہے۔ مگر خدا کے پیغام کو ماننا یا اس کا انکار کرنا مدعو کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کے پاس جو بھی ترجمۂ قرآن میسر ہو اس کو دینے کی کوشش کریں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ مدعو کی قابلِ فہم زبان میں ہو۔ اگر امت مسلمہ اس دور میں صرف اتنا کام کردے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت تمام کرنے کے مترادف ہوگا (مولانا اقبال احمد عمری، عمر آباد، تامل ناڈو)۔

4۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، طارق بدر صاحب! اللہ تعالی آپ کو ڈھیر ساری خوشیاں نصیب کرے۔ کیوں کہ آپ مولانا وحید الدین صاحب کے مشن کو عام کرنے میں سرگرم ہیں۔ اللہ ہمیں بھی توفیق دے کہ ہم اس مشن کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچائیں۔ اپنے ذاتی تجربہ کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس میں ہماری فلاح ہے۔ جس طرح مولانا صاحب کو پڑھتے ہوئے میرے ایمان کو تقویت ملتی ہے، کسی اور عالم دین کو پڑھنے سے اس طرح مجھے ایمانی تقویت نہیں مل پاتی ہے۔ میں مولانا صاحب کی فکر سے میں بہت زیادہ متاثر ہوں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میں مولانا کی تعلیمات کو عام کروں۔ آج کے فتنہ وفساد والے دور میں میں مستقل طور پر اپنے آپ کو ان کی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے لگانا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے مجھے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے مولانا کی بنیادی فکر رکھنے والی تصانیف بھیج دیں (سجاد حمزہ، بونیر، کے پی کے)۔

5۔ الرسالہ (اکتوبر-دسمبر 2021) مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ اس میں ایک مضمون ہے ''الحاد یا ڈی کنڈیشننگ'' ۔ یہ ایک مبنی برحقیقت اور حکمت سے بھرپور مضمون ہے۔ اس مضمون میں جو کچھ کہا گیا ہے اس روشنی میں اپنے کچھ دعوتی تجربات شیئر کررہا ہوں۔ گزشتہ رمضان میں قرآن کی کافی تعداد میں ریکوسٹ موصول ہوئیں۔ ناگپور ٹیم نے کچھ قرآن بذریعہ پوسٹ بھیج دیے اور بہت سے قرآن میں نے ساجد احمد خان صاحب کے ساتھ مل کر ذاتی طور پر پہنچائے۔ قرآن کی ریکوسٹ زیادہ تر سیکولر تعلیم حاصل کرنے والے اعلی تعلیم یافتہ نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کی تھیں۔ اس میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان نوجوانوں میں قرآن کو سمجھنے کی چاہ بہت زیادہ ہے۔ اس لیے انہوں نے قابلِ فہم زبان میں قرآن کا مطالبہ کیا۔ بعض لڑکیوں نے تو یہاں تک کہا کہ ہماری تعلیم انگریزی زبان میں ہوئی ہے۔ قرآن کے ترجمے زیادہ تر اردو زبان میں ہیں، اس لیے قرآن کو سمجھنے کے لیے ہم نے اردو زبان سیکھی۔ اس تجربے سے مولانا صاحب کی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ''ماڈرن ایجوکیشن کے ادارے اپنی حقیقت کے اعتبار سے 'قتل گاہ' نہیں ہیں، بلکہ وہ تطہیرِ ذہن (ڈی کنڈیشننگ) کے ادارے ہیں۔ ذہنی تطہیر کے اس عمل کی بنا پر ایسے لوگ اس قابل ہوگئے ہیں کہ وہ کسی بات کو زیادہ کھلے ذہن کے ساتھ سمجھ سکیں''۔ بعض نوجوانوں سے گفتگو کے دوران یہ اندازہ ہوا کہ آبائی طور پر ملا ہوا مذہب شاید ان کے مائنڈ کو ایڈریس نہیں کر پارہا ہے اور وہ اپنے مائنڈ کی ری انجینئرنگ کرکے اسلام کو ری ڈسکور کرنا چاہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ بقول مولانا صاحب ''ان کے گھر اور ان کے ماحول نے ان کے اندر اپنے آبائی مذہب کے لیے جو عقیدت پیدا کی تھی، اس کو جدید تعلیم نے ختم کردیا، گویا کہ ان کی فطرت کے اوپر جو روایتی پردہ پڑ گیا تھا، وہ ہٹ گیا اور وہ اپنی اصلی فطرت کے قریب آگئے''۔ چنانچہ ناگپور ٹیم نے یہ پلان بنایا ہے کہ زیادہ سے زیادہ نوجوانوں تک سی پی ایس مشن کو پہنچایا جائے۔ قرآن کے لیے ریکوسٹ کرنے والے ان نوجوانوں کا ایک واٹس اپ گروپ بنایا گیا ہے جس میں مولانا وحید الدین خاں صاحب کے آڈیوز، وڈیوز اور مضامین شیئر کیے جاتے ہیں، جس سے ان کو مزید فائدہ حاصل ہوتا ہے (محمد عرفان رشیدی، کامٹی، ناگپور)۔

6۔ 1 نومبر 2021 سی پی ایس امریکا کے ایک ممبر نے ہارورڈ ڈیونٹی اسکول کیمبرج، بوسٹن کے سامنے تقسیم قرآن کا ایک اسٹال لگایا۔ کافی لوگ اسٹال پر آئے اور ترجمۂ قرآن اور اسلام کے تعارف پر مبنی لٹریچر حاصل کیا۔ ایک

اکیڈمک اسٹاف نے بتایا کہ وہ مولانا وحید الدین خاں صاحب کو پہلے سے جانتے ہیں، اور ان کی کتابیں پڑھ چکے ہیں (خواجہ کلیم الدین، امریکا)۔

7- بتاریخ 5 دسمبر سے 10 دسمبر 2021 تک آندھرا پردیش کے چند علاقوں، بھیما ورم، نڈدول، راجمندری، تانوکو اور وشاکھاپٹنم کا دورہ ہوا، اور علما حضرات سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان تمام حضرات کے ساتھ سی پی ایس مشن کے تعلق سے گفتگو ہوئی۔ ٹرین میں ایک خوشگوار تجربہ پیش آیا۔ اس بنا پر ہم سفر غیر مسلموں کے درمیان آسانی سے دعوتی کام کا موقع ملا۔ ہوا یہ کہ ٹرین میں میرے پڑوس کی سیٹ پر کچھ غیر مسلم مسافر تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ میری سیٹ وہ لے لیں، اور مجھے کوئی اور سیٹ دیں۔ مگر مجھے دیکھ کر وہ کہنے میں جھجک رہے تھے۔ میں نے ان کے ارادہ کو سمجھ کر فوراً ان سے کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں آپ جیسا چاہتے ہیں، وہ میں کر دیتا ہوں۔ میں آپ کے لیے نو پرابلم پڑوسی بن کر رہوں گا۔ یہ سن کر وہ بہت زیادہ خوش ہوئے، اور تمام لوگ میرے دوست بن گئے۔ انھوں خوشی خوشی میری باتیں سنی، اور ترجمۂ قرآن کریم، اور دیگر دعوتی لٹریچر قبول کیا۔ وشاکھاپٹنم میں سی پی ایس مشن کے ممبران عبد المبین صاحب، نور محمد صاحب، ڈاکٹر یاسین اور عبد الشکور صاحب ان تمام سے ملاقات ہوئی۔ سب نے اپنے دعوتی تجربات بتائے اور خدا کے پیغام، قرآن کو ساری انسانیت تک پہنچانے کا از سر نو عہد کیا۔ ان حضرات سے جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی کہ دعوت میں استقامت کی ایک ہی شرط ہے۔ یعنی ہماری ذمہ داری یہی ہے کہ مدعو تک قرآن کا پیغام پہنچایا جائے اور ان کی ہدایت کے لیے اللہ سے دعا کرتے رہیں۔ اس حقیقت کو ہم اصولی طور پر اچھی طرح جان لیں۔ اگر اس سے زیادہ کوئی نتیجہ ہم چاہتے ہوں تو ہمیں مایوس ہونا پڑے گا۔ کیوں کہ قرآن (28:56) کے مطابق، دعوت وتبلیغ ہماری ذمہ داری ہے، مگر ہدایت دینا اللہ کا معاملہ ہے۔ (مولانا اقبال احمد عمری، عمر آباد، تامل ناڈو)۔

8- 25 دسمبر 2021 کو کرسمس کے موقع پر گلمرگ میں سیاحوں کی کافی بھیڑ تھی۔ اس مناسبت سے سی پی ایس کشمیر کے تین ممبران حمید اللہ حمید صاحب، اعجاز احمد صاحب، اور مختار احمد صاحب گلمرگ گئے اور سیاحوں کے درمیان تراجم قرآن اور دیگر دعوتی لٹریچر تقسیم کیا۔ کافی اچھا رسپانس ملا۔ گلمرگ کلب میں ایک ہفتہ کا Christmas and New year festival رکھا گیا تھا، جس میں کثیر تعداد میں ممتاز شخصیات شریک ہوئے تھے۔ ان سب کو دعوتی لٹریچر پیش کیا گیا جو انہوں نے انتہائی خوشی اور شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔

9- سی پی ایس (سہارنپور) کی ایک ٹیم نے ڈاکٹر محمد اسلم خان کی قیادت میں 31 مارچ 2022 کو نگینہ، دھام پور اور دیوبند کا دورہ کیا۔ دھام پور میں مختلف لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مثلاً جناب ماہتاب صاحب (ممبر سی پی ایس دھام پور)، ڈاکٹر سکندر، ڈاکٹر ورما، ڈاکٹر سمن، ڈاکٹر آصف، مسٹر ارشاد ملتانی، مسٹر شاہنواز زیدی، ایڈووکیٹ نوید، اور مسٹر جاوید، وغیرہ۔ ان تمام لوگوں کے ساتھ سی پی ایس مشن کو لے کر گفتگو ہوئی، اور ان کو دعوتی لٹریچر دیا گیا۔ پھر وہاں سے دار العلوم دیوبند میں جانا ہوا۔ وہاں کی لائبریری میں مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتابوں کا سٹ دیا گیا۔ اس کے علاوہ دیوبند میں موجود دیگر علما کرام سے ملاقاتیں ہوئیں۔

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23